

# Tafheemul Quran in Colors Arabic Urdu 034 Saba Syed Abul Aala Maududi Evergreen Islamic Center

سَبَا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

نام

آیت 15 کے فقرے لَقَدْ كَانَ لِسَبَا فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةً سے ماخوذ ہے مراد یہ ہے کہ وہ سورۃ جس میں سبَا کا ذکر ہے۔

زمانہ نزول

اس کے نزول کا ٹھیک زمانہ کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ انداز بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ یا تو مکہ کا دور متوسط ہے یا دور اول۔ اور اگر دور متوسط ہے تو غالباً اس کا ابتدائی زمانہ ہے جبکہ ظلم و ستم کی شدت شروع نہ ہوئی تھی اور ابھی صرف تضحیک استہزاء، افواہی جنگ، جھوٹے الزامات اور وسوسہ اندازیوں سے اسلام کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

موضوع اور مضمون

اس سورۃ میں کفار کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت توحید و

آخرت پر اور خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر زیادہ تر طنز و تمسخر اور بیہودہ الزامات کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ ان اعتراضات کا جواب ہمیں تو ان کو نقل کر کے دیا گیا ہے، اور ہمیں تقریر سے خود یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کس اعتراض کا جواب ہے۔ جوابات اکثر و بیشتر تفہیم و تذکیر اور استدلال کے انداز میں ہیں، لیکن ہمیں کفار کو ان کی ہٹ دھرمی کے برے انجام سے ڈرایا بھی گیا ہے۔ اسی سلسلہ میں حضرت داؤد و سلیمان اور قوم سبا کے قصے اس غرض کے لیے بیان کیے گئے ہیں کہ تمہارے سامنے تاریخ کی یہ دونوں مثالیں موجود ہیں۔ ایک طرف حضرت داؤد اور سلیمان ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی طاقتیں بخشیں اور وہ شوکت و حشمت عطا کی جو پہلے کم ہی کسی کو ملی ہے، مگر یہ سب کچھ پا کر وہ کبر و غرور میں مبتلا نہ ہوئے بلکہ اپنے رب کے خلاف بغاوت کرنے کے بجائے اس کے شکر گزار بندے ہی بنے رہے۔ اور دوسری طرف سبا کی قوم ہے جسے اللہ نے جب اپنی نعمتوں سے نوازا تو وہ پھول گئی اور آخر کار اس طرح پارہ پارہ ہوئی کہ اس کے بس افسانے ہی اب دنیا میں باقی رہ گئے ہیں۔ ان دونوں مثالوں کو سامنے رکھ کر خود رائے قائم کر لو کہ توحید و آخرت کے یقین اور شکر نعمت کے جذبے سے جو زندگی بنتی ہے وہ زیادہ بہتر یا وہ زندگی جو کفر و شرک اور انکارِ آخرت اور دنیا پرستی کی بنیاد پر بنتی ہے۔

اللہ کے نام سے جو بہت مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سب تعریف اللہ کی ہے وہ جس کیلئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے \*1 اور اس کیلئے ہے سب تعریف آخرت میں \*2۔ اور وہ ہے حکمت والا خبردار۔ \*3

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ  
وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ لَهٗ الْحَمْدُ فِی  
الْاٰخِرَةِ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْحَبِیْرُ ﴿١﴾

\*1 حمد کا لفظ عربی زبان میں تعریف اور شکر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہاں دونوں معنی مراد ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا مالک ہے تو لا محالہ اس کائنات میں جمال و کمال اور حکمت و



قدرت اور صناعی و کاری گری کی جو شان بھی نظر آتی ہے اس کی تعریف کا مستحق وہی ہے۔ اور اس کائنات میں رہنے والا جس چیز سے بھی کوئی فائدہ یا لطف و لذت حاصل کر رہا ہے اس پر خدا ہی کا شکر اسے ادا کرنا چاہئے کوئی دوسرا جب ان اشیاء کی ملکیت میں شریک نہیں ہے تو اسے نہ حمد کا استحقاق پہنچتا ہے نہ شکر کا۔

**2\*** یعنی جس طرح اس دنیا کی ساری نعمتیں اسی کی بخشش میں اسی طرح آخرت میں بھی جو کچھ کسی کو ملے گا اسی کے خزانوں سے اور اسی کی عطا سے ملے گا، اس لیے وہاں بھی وہی تعریف کا مستحق بھی ہے اور شکر کا مستحق بھی۔

**3\*** یعنی جس کے سارے کام کمال درجہ حکمت و دانائی پر مبنی ہیں، جو کچھ کرتا ہے بالکل ٹھیک کرتا ہے۔ اور اسے اپنی ہر مخلوق کے متعلق پورا علم ہے کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے، کیا اس کی ضروریات ہیں، کیا کچھ اس کی مصلحت کے لیے مناسب ہے، کیا اس نے اب تک کیا ہے اور آگے کیا اس سے صادر ہونے والا ہے۔ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا سے بے خبر نہیں ہے بلکہ اسے ذرے ذرے کی حالت پوری طرح معلوم ہے۔

وہ جانتا ہے جو داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو نکلتا ہے اس میں سے اور جو اترتا ہے آسمان سے اور جو چڑھتا ہے اس میں۔ اور وہ ہے مہربان بخشنے والا۔<sup>4\*</sup>

يَعْلَمُ مَا يَلْبِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ ﴿٢﴾

**4\*** یعنی ایسا نہیں ہے کہ اس کی سلطنت میں اگر کوئی شخص یا گروہ اس کے خلاف بغاوت کرنے کے باوجود پکڑا نہیں جا رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ دنیا اندھیر نگری ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رحیم ہے اور درگزر سے کام لینا اس کی عادت ہے۔ حاصی اور خاطمی کو قصور سرزد ہوتے ہی پکڑ لینا، اس کا رزق بند کر دینا، اس کے جسم کو مفلوج کر دینا اس کو آناً فاناً ہلاک کر دینا، سب کچھ اس کے قبضے میں ہے، مگر وہ ایسا کرتا نہیں ہے۔ یہ اس کی شان رحیمی کا تقاضا ہے کہ قادر مطلق ہونے کے باوجود وہ نافرمان بندوں کو ڈھیل دیتا ہے، سنبھلنے کی مہلت عطا کرتا ہے، اور جب بھی وہ باز آجائیں، معاف کر دیتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ<sup>ط</sup>  
 قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ<sup>ص</sup> عِلْمِ الْغَيْبِ<sup>ج</sup>  
 لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي  
 السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرَ  
 مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ  
 مُّبِينٍ<sup>ح</sup>

اور کہا انہوں نے جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں آئے  
 گی ہم پر (قیامت کی) گھڑی<sup>5\*</sup>۔ کدو ہاں قسم  
 ہے میرے رب کی وہ تم پر ضرور آئیگی۔<sup>6\*</sup>  
 (اللہ ہے) جاننے والا غیب کا۔ نہیں پوشیدہ  
 اس سے ہے ذرہ بھر (کوئی چیز) آسمانوں میں  
 اور نہ زمین میں اور نہ کوئی چھوٹی چیز اس سے  
 اور نہ بڑی چیز مگر کتاب روشن میں ہے<sup>7\*</sup>۔

**5\*** یہ بات وہ طنز اور مسخر کے طور پر کہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بہت دنوں سے یہ پیغمبر صاحب  
 قیامت کے آنے کی خبر سنا رہے ہیں، مگر کچھ خبر نہیں کہ وہ آتے آتے کہاں رہ گئی۔ ہم نے اتنا کچھ انہیں  
 جھٹلایا، اتنی گستاخیاں کیں، ان کا مذاق تک اڑایا، مگر وہ قیامت ہے کہ کسی طرح نہیں آچکتی۔

**6\*** پروردگار کی قسم کھاتے ہوئے اس کے لیے ”عالم الغیب“ کی صفت استعمال کرنے سے خود بخود اس امر  
 کی طرف اشارہ ہو گیا کہ قیامت کا آنا تو یقینی ہے مگر اس کے آنے کا وقت خدائے عالم الغیب کے سوا کسی کو  
 معلوم نہیں۔ یہی مضمون قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان ہوا ہے۔ تفصیل کے  
 لیے ملاحظہ ہو۔ الاعراف، 187۔ طہ، 15۔ لقمان، 34۔ الاحزاب، 63۔ الملک، 25-26۔ النازعات، 42 تا 44۔

**7\*** یہ امکان آخرت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔ جیسا کہ آگے آیت نمبر 7 میں آ رہا ہے، منکرین  
 آخرت جن وجوہ سے زندگی بعد موت کو بعید از عقل سمجھتے تھے ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ جب  
 سارے انسان مر کر مٹی میں رل مل جائیں گے اور ان کا ذرہ ذرہ منتشر ہو جائے گا تو کس طرح یہ ممکن ہے کہ یہ  
 بے شمار اجزا پھر سے اکٹھے ہوں اور ان کو جوڑ کر ہم دوبارہ اپنے انہی اجسام کے ساتھ پیدا کر دیے جائیں۔ اس  
 شبہ کو یہ کہ کر رفع کیا گیا ہے کہ ہر ذرہ جو کہیں گیا ہے، خدا کے دفتر میں اس کا اندراج موجود ہے اور خدا کو معلوم

ہے کہ کیا چیز کہاں گئی ہے۔ جب وہ دوبارہ پیدا کرنے کا ارادہ کرے گا تو اسے ایک ایک انسان کے اجزائے جسم کو سمیٹ لانے میں کوئی زحمت پیش نہ آنے گی۔

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَرْزُقُ كَرِيمٌ ﴿٤﴾

ناکہ وہ جزا دے انکو جو ایمان لائے اور کرتے رہے نیک اعمال۔ یہی لوگ ہیں جنکے لئے ہے مغفرت اور رزق کریم۔

وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رَّجْزٍ أَلِيمٌ ﴿٥﴾

اور وہ لوگ جنہوں نے کوشش کی ہماری آیتوں کو نیچا دکھانے کی یہ لوگ ہیں جنکے لئے ہے عذاب سخت دردناک۔ \*8

\*8 اوپر آخرت کے امکان کی دلیل تھی، اور یہ اس کے وجوب کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا وقت ضرور آنا ہی چاہیے جب ظالموں کو ان کے ظلم کا اور صالحوں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیا جائے۔ عقل یہ چاہتی ہے اور انصاف یہ تقاضا کرتا ہے کہ جو نیکی کرے اسے انعام ملے اور جو بدی کرے وہ سزا پائے۔ اب اگر تم دیکھتے ہو کہ دنیا کی موجودہ زندگی میں نہ ہر بد کو اس کی بدی کا اور نہ ہر نیک کو اس کی نیکی کا پورا بدلہ ملتا ہے، بلکہ بسا اوقات بدی اور نیکی کے لئے نتائج بھی نکل آتے ہیں، تو تمہیں تسلیم کرنا چاہیے کہ عقل اور انصاف کا یہ لازمی تقاضا کسی وقت ضرور پورا ہونا چاہیے۔ قیامت اور آخرت اسی وقت کا نام ہے۔ اس کا آنا نہیں بلکہ نہ آنا عقل کے خلاف اور انصاف سے بعید ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی اوپر کی آیات سے واضح ہوتا ہے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ مغفرت اور رزق کریم ہے۔ اور جو لوگ خدا کے دین کو نیچا دکھانے کے لیے معاندانہ جدوجہد کریں ان کے لیے بدترین قسم کا عذاب ہے۔ اس سے خود بخود یہ ظاہر ہو گیا کہ جو شخص سچے دل سے ایمان لائے گا اس کے عمل میں اگر کچھ خرابی بھی ہو تو وہ رزق کریم چاہے نہ پائے مگر مغفرت سے محروم نہ رہے گا اور جو شخص کافر ہو مگر دین حق کے مقابلے میں عناد و مخالفت کی روش بھی اختیار نہ کرے وہ عذاب سے تو نہ بچے گا مگر بدترین عذاب اس کے لیے نہیں ہے۔

اور دیکھتے ہیں وہ جن کو دیا گیا ہے علم کہ جو نازل  
 ہوا ہے تم پر تمہارے رب کی طرف سے وہ  
 حق ہے۔ اور وہ رہنمائی کرتا ہے راستہ پر جو ہے  
 غالب قابل تعریف کا۔ \*9

وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ  
 إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ الْحَقُّ وَيَهْدِي إِلَى  
 صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴿٩﴾

\*9 یعنی یہ معاندین تمہارے پیش کردہ حق کو باطل ثابت کرنے کے لیے خواہ کتنا ہی زور لگائیں، ان کی یہ  
 تدبیریں کامیاب نہیں ہو سکتیں، کیونکہ ان باتوں سے وہ جہلا ہی کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ علم رکھنے والے لوگ  
 ان کے فریب میں نہیں آتے۔

اور کہا انہوں نے جنہوں نے کفر کیا کیا ہم بتائیں  
 تمہیں ایک آدمی جو تمہیں خبر دیتا ہے کہ جب  
 تم ریزہ ریزہ بکھر جاؤ گے بالکل ریزہ ریزہ۔ تو بلاشبہ  
 تم تخلیق ہو گے نئے سرے سے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَى  
 رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُرِّقْتُمْ كُلَّ مُمْرَقٍ  
 إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٠﴾

گھڑ لیا ہے اس نے اللہ پر جھوٹ یا اسمیں جنون  
 ہے۔ \*10 بلکہ جو لوگ ایمان نہیں رکھتے آخرت پر  
 وہ عذاب میں ہونگے اور گمراہی میں بہت دور  
 کی۔ \*11

أَفْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَمْ بِهِ جِنَّةٌ  
 بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي  
 الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ الْبَعِيدِ ﴿١١﴾

\*10 قریش کے سردار اس بات کو خوب جانتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا تسلیم کرنا عوام الناس  
 کے لیے سخت مشکل ہے، کیونکہ ساری قوم آپ کو صادق القول جانتی تھی اور کبھی ساری عمر کسی نے آپ کی  
 زبان سے کوئی جھوٹی بات نہ سنی تھی۔ اس لیے وہ لوگوں کے سامنے اپنا الزام اس شکل میں پیش کرتے تھے



کہ یہ شخص جب زندگی بعد موت جیسی انہونی بات زبان سے نکالتا ہے تو لامحالہ اس کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو (معاذ اللہ) یہ شخص جان بوجھ کر ایک جھوٹی بات کہہ رہا ہے، یا پھر یہ مجنون ہے۔ لیکن یہ مجنون والی بات بھی اتنی ہی بے سرو پا تھی جتنی جھوٹ والی بات تھی۔ اس لیے کہ کوئی عقل کا اندھا ہی ایک کمال درجہ کے عاقل و فہیم آدمی کو مجنون مان سکتا تھا، ورنہ آنکھوں دیکھتے کوئی شخص جیتی مکھی کیسے نکل لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بیوہ بات کے جواب میں کسی استدلال کی ضرورت محسوس نہ فرمائی اور کلام صرف ان کے اس اچنبھے پر کیا جو موت کے امکان پر وہ ظاہر کرتے تھے۔

**11\*** یہ ان کی بات کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نادانو، عقل تو تمہاری ماری گئی ہے کہ جو شخص حقیقت حال سے تمہیں آگاہ کر رہا ہے اس کی بات نہیں مانتے اور سرپٹ اس راستے پر چلے جا رہے ہو جو سیدھا جہنم کی طرف جاتا ہے، مگر تمہاری حماقت کی طغیانی کا یہ عالم ہے کہ الٹا اس شخص کو مجنون کہتے ہو جو تمہیں بچانے کی فکر کر رہا ہے۔

تو کیا نہیں دیکھا انہوں نے اسکو جو ہے انکے آگے اور جو ہے انکے پیچھے آسمان میں اور زمین میں۔ اگر ہم چاہیں تو دھنسا دیں انکو زمین میں یا گرا دیں ان پر ایک ٹکڑا آسمان کا۔ **12\*** یقیناً اسمیں ایک نشانی ہے ہر بندے کے لئے جو رجوع کرتا ہے (اللہ کی طرف)۔ **13\***

أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ إِنَّ نَشْأَنَا نَحْسِفُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نَسْقِطُ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ﴿١٢﴾

**12\*** یہ ان کی بات کا دوسرا جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے یہ حقیقت نگاہ میں رہنی چاہیے کہ کفار قریش جن وجہ سے زندگی بعد موت کا انکار کرتے تھے ان میں تین چیزیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ خدا کے محابے اور باز پرس کو نہیں ماننا چاہتے تھے کیونکہ اسے مان لینے کے بعد دنیا میں من مانی کرنے کی آزادی ان سے چھن جاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ قیامت کے وقوع اور نظام عالم کے درہم برہم ہو

جانے اور پھر سے ایک نئی کائنات بننے کو ناقابل تصور سمجھتے تھے۔ تیسرے یہ کہ جن لوگوں کو مرے ہوئے سینکڑوں ہزاروں برس گزر چکے ہوں اور جن کی ہڈیاں تک ریزہ ریزہ ہو کر زمین، ہوا اور پانی میں پر آگندہ ہو چکی ہوں ان کا دوبارہ جسم و جان کے ساتھ جی اٹھنا ان کے نزدیک بالکل بعید از امکان تھا۔ اوپر کا جواب ان تینوں پہلوؤں پر حاوی ہے، اور مزید پراں اس میں ایک سخت تشبیہ بھی مضمربے۔ ان مختصر سے فقروں میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس کی تفضیل یہ ہے۔

1- اس زمین و آسمان کو اگر کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا ہوتا تو تمہیں نظر آتا کہ یہ کوئی کھلونا نہیں ہے، اور نہ یہ نظام اتفاقاً بن گیا ہے، اس کائنات کی ہر چیز اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اسے ایک قادر مطلق نے کمال درجہ حکمت کے ساتھ بنایا ہے۔ ایسے ایک حکیمانہ نظام میں یہ تصور کرنا کہ یہاں کسی کو عقل و تیز و اختیارات عطا کرنے کے بعد اسے غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ چھوڑا جا سکتا ہے، سراسر ایک لغو بات ہے۔

2- اس نظام کو جو شخص بھی دیدہ بینا کے ساتھ دیکھے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ قیامت کا آجانا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ زمین اور آسمان جن بندشوں پر قائم ہیں ان میں ایک ذرا سا الٹ پھیر بھی ہو جائے تو آناً فاناً قیامت برپا ہو سکتی ہے۔ اور یہی نظام اس بات پر بھی گواہ ہے کہ جس نے آج یہ دنیا بنا رکھی ہے وہ ایک دوسری دنیا پھر بنا سکتا ہے۔ اس کے لیے ایسا کرنا مشکل ہوتا تو یہی دنیا کیسے بن کھڑی ہوتی۔

3- تم نے آخر خالق ارض و سما کو کیا سمجھ رکھا ہے کہ مرے ہوئے انسانوں کو دوبارہ پیدا کیے جانے کو اسکی قدرت سے باہر خیال کر رہے ہو، جو لوگ مرتے ہیں ان کے جسم پارہ پارہ ہو کر خواہ کتنے ہی منتشر ہو جائیں، رہتے تو اسی زمین و آسمان کے حدود میں ہیں۔ اس سے کہیں باہر تو نہیں چلے جاتی۔ پھر جس خدا کے یہ زمین و آسمان ہیں اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ مٹی اور پانی اور ہوا میں جو چیز جہاں بھی ہے اسے وہاں سے نکال لائے۔

تمہارے جسم میں اب جو کچھ موجود ہے وہ بھی اسی کا جمع کیا ہوا ہے اور اسی مٹی، ہوا اور پانی میں سے نکال لایا گیا ہے۔ ان اجزا کی فراہمی اگر آج ممکن ہے تو کل کیوں غیر ممکن ہو جائے گی۔ ان تینوں دلیلوں کے ساتھ اس کلام میں یہ تشبیہ بھی پوشیدہ ہے کہ تم ہر طرف سے خدا کی خدائی میں گھرے ہوئے ہو۔ جہاں بھی جاؤ گے یہی کائنات تم پر محیط ہوگی۔ خدا کے مقابلے میں کوئی جائے پناہ تم نہیں پاسکتے اور خدا کی قدرت کا حال یہ ہے کہ



جب وہ چاہے تمہارے قدموں کے نیچے سے یا سر کے اوپر سے جو بلا چاہے تم پر نازل کر سکتا ہے۔ جس زمین کو آغوشِ مادر کی طرح تم اپنے لیے جائے سکون پاتے ہو اور اطمینان سے اس پر گھر بنانے بیٹھے ہو تمہیں کچھ پتہ نہیں کہ اس کی سطح کے نیچے کیا قوتیں کام کر رہی ہیں اور کب وہ کوئی زلزلے لاکر اسی زمین کو تمہارے لیے مرقد بنا دیتی ہیں۔ جس آسمان کے نیچے تم اس اطمینان کے ساتھ چل پھر رہے ہو گویا کہ یہ تمہارے گھر کی چھت ہے، تمہیں کیا معلوم کہ اسی آسمان سے کب کوئی بجلی گر پڑتی ہے، یا ہلاکت خیز بارش ہوتی ہے، یا اور کوئی ناگہانی آفت آجاتی ہے۔ اس حالت میں تمہاری خدا سے یہ بے خوفی اور فکرِ عاقبت سے یہ غفلت اور ایک خیر خواہ کی نصیحت کے مقابلے میں یہ یا وہ کوئی بجز اس کے اور کیا معنی رکھتی ہے کہ تم اپنی شامت ہی کو دعوت دے رہے ہو۔

**13\*** یعنی جو شخص کسی قسم کا تعصب نہ رکھتا ہو، جس میں کوئی ہٹ دھرمی اور ضد نہ پائی جاتی ہو، بلکہ جو اخلاص کے ساتھ اپنے خدا سے طالبِ ہدایت ہو، وہ تو آسمان و زمین کے اس نظام کو دیکھ کر بڑے سبق لے سکتا ہے۔ لیکن جس کا دل خدا سے پھرا ہوا ہو وہ کائنات میں سب کچھ دیکھے گا مگر حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والی کوئی نشانی اسے سمجھائی نہ دے گی۔

اور بیشک عطا کیا تھا ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے فضل <sup>14\*</sup>۔ اے پہاڑوں تسبیح کرو اسکے ساتھ اور پرندوں <sup>15\*</sup>۔ اور نرم کر دیا تھا ہم نے اسکے لئے لوہا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ لِيَجِبَالُ  
أَوْبِي مَعَهُ وَالطَّيْرِ ۗ وَالنَّارُ لهُ  
الْحَدِيدُ ۙ

**14\*** اشارہ ہے ان بے شمار عنایات کی طرف جن سے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو نوازا تھا۔ وہ بیت اللحم کے رہنے والے قبیلہ یہوداہ کے ایک معمولی نوجوان تھے۔ فلسٹیوں کے خلاف ایک معرکے میں جالوت جیسے گرانڈیل دشمن کو قتل کر کے یکایک وہ بنی اسرائیل کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ اس واقعہ سے ان کا عروج شروع ہوا یہاں تک کہ طالوت کی وفات کے بعد پہلے وہ خبرون (موجودہ الخلیل) میں یہودیہ کے فرمانروا بنائے گئے، پھر چند سال بعد تمام قبائل بنی اسرائیل نے مل کر ان کو اپنا بادشاہ منتخب کیا، اور انہوں نے

یروشلم کو فتح کر کے اسے دولت اسرائیل کا پایہ تخت بنایا۔ یہ انہی کی قیادت تھی جس کی بدولت تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی خدا پرست سلطنت وجود میں آئی جس کے حدود خلیج عقبہ سے دریائے فرات کے مغربی کناروں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان عنایات پر مزید وہ فضل خداوندی ہے جو علم و حکمت، عدل و انصاف، اور خدا ترسی و بندگی حق کی صورت میں ان کو نصیب ہوا (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول۔ ص 595 تا 598)۔

**15\*** یہ مضمون اس سے پہلے سورہ انبیا آیت 79 میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تشریح بھی کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم 174-175)۔

کہ تیار کرو کشادہ زریں اور اندازے سے **16\*** جوڑو کرڑیوں کو (اس کی) اور کرتے رہو نیک عمل۔ یقیناً میں اسکو جو کچھ تم کرتے ہو دیکھ رہا ہوں۔

أَنْ أَعْمَلَ سَبِغْتِ وَ قَدَّرَ فِي السَّرْدِ وَ  
أَعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ



**16\*** یہ مضمون بھی سورہ انبیا آیت 80 میں گزر چکا ہے اور وہاں اس کی تشریح کی جا چکی ہے۔ (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم ص 175-176)۔

اور سلیمان کے لئے (ہم نے تابع کر دیا) ہوا کو اسکی صبح کی منزل ایک ماہ کی اور اسکی شام کی منزل ایک ماہ کی **17\***۔ اور بہا دیا ہم نے اسکے لئے چشمہ تابے کا **18\***۔ اور جنوں میں سے ایسے تھے جو کام کرتے تھے اسکے آگے اسکے رب کے حکم سے **19\***۔ اور جس نے خلاف ورزی کری ان میں سے ہمارے حکم کی چکھائیں گے ہم اسکو عذاب جہنم کی آگ کا۔

وَ لِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غَدُوَهَا شَهْرٌ وَ  
مَرَاَحَهَا شَهْرٌ وَ أَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ  
وَ مِنَ الْجِنَّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ  
رَبِّهِ وَ مَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا  
نَذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ



**17\*** یہ مضمون بھی سورۃ الانبیاء آیت 81 میں گزر چکا ہے اور اس کی تشریح وہاں کی جا چکی ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم 176-177)۔

**18\*** بعض قدیم مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ زمین سے ایک چشمہ حضرت سلیمان کے لیے پھوٹ نکلا تھا جس میں سے پانی کے بجائے پگھلا ہوا تانبہ بہتا تھا۔ لیکن آیت کی دوسری تاویل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں تانبے کو پگھلانے اور اس سے طرح طرح کی چیزیں بنانے کا کام بڑے پیمانے پر کیا گیا کہ گویا وہاں تانبے کے چشمے بہ رہے تھے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص 176)۔

**19\*** یہ جن جو سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کیے گئے تھے، آیا یہ دہقانی اور کوہستانی انسان تھے یا واقعی وہی جن تھے جو ایک پوشیدہ مخلوق کی حیثیت سے دنیا بھر میں معروف ہیں، اس مسئلے پر بھی سورۃ الانبیاء اور سورۃ النحل کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔

وہ کرتے تھے اسکے لئے جو کچھ وہ چاہتا محرابیں اور تصویریں\*20 اور لگن جیسے تالاب اور دیگیں\*21 ایک ہی جگہ جمی ہوئی۔ ادا کرتے رہو اے آل داؤد شکر\*22۔ اور تھوڑے میرے بندوں میں شکر گزار ہیں۔

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِبٍ وَ تَمَاثِيلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُورٍ رَاسِيَتٍ ۗ اِعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا وَ قَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّاكِرِينَ ﴿١٣﴾

**20\*** اصل میں لفظ تماثیل استعمال ہوا ہے جو تمثال کی جمع ہے۔ تمثال عربی زبان میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قدرتی شے کے مشابہ بنائی جائے قطع نظر اس اصل سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا حیوان، کوئی درخت ہو یا پھول یا دریا یا کوئی دوسری بے جان چیز۔ التمثال اسم للشيء المصنوع مشبهاً بخلق من خلق الله (لسان العرب) "تمثال نام ہے ہر اس مصنوعی چیز کا جو خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے مانند بنائی گئی ہو،" التمثال کل ما صور على صورة غيره من حيوان و غير حيوان۔ (تفسیر کشاف) تمثال ہر اس تصویر کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز



کی صورت کے مماثل بنائی گئی ہو، خواہ وہ جان دار ہو یا بے جان۔“ اس بنا پر قرآن مجید کے اس بیان سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جو ”تماشیل“ بنائی جاتی تھیں وہ ضرور انسانوں اور حیوانوں کی تصاویر یا ان کے مجسمے ہی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پھول پتیاں اور قدرتی مناظر اور مختلف قسم کے نقش و نگار ہوں جن سے حضرت سلیمان نے اپنی عمارتوں کو آراستہ کرایا ہو۔

غلط فہمی کا منشا بعض مفسرین کے یہ بیانات ہیں کہ حضرت سلیمان نے انبیاء اور ملائکہ کی تصویریں بنوائی تھیں۔ یہ باتیں ان حضرات نے بنی اسرائیل کی روایات سے اخذ کر لیں اور پھر ان کی توجیہ یہ کی کہ پچھلی شریعتوں میں اس قسم کی تصویر بنانا ممنوع نہ تھا لیکن ان روایات کو بلا تحقیق نقل کرتے ہوئے ان بزرگوں کو یہ خیال نہ رہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جس شریعت موسوی کے پیرو تھے اس میں بھی انسانی اور حیوانی تصاویر اور مجسمے اسی طرح حرام تھے جس طرح شریعت محمدیہ میں حرام ہیں۔ اور وہ یہ بھی بھول گئے کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو حضرت سلیمان سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر انہوں نے آجناب کو شرک و بت پرستی جادو گرمی اور زنا کے بدترین الزامات سے متهم کیا ہے، اس لیے ان کی روایات پر اعتماد کر کے اس جلیل القدر پیغمبر کے بارے میں کوئی ایسی بات ہرگز قبول نہ کرنی چاہیے جو خدا کی بھیجی ہوئی کسی شریعت کے خلاف پڑتی ہو۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء بھی آئے ہیں وہ سب توراہ کے پیرو تھے ان میں سے کوئی بھی نئی شریعت نہ لایا تھا جو توراہ کے قانون کی ناسخ ہوتی۔ اب توراہ کو دیکھیے تو اس میں بار بار بصراحت یہ حکم ملتا ہے کہ انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسمے قطعاً حرام ہیں :

”تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا نہ کوئی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے“ (خروج۔ باب 20۔ آیت 4)۔

تم اپنے لیے بت نہ بنانا اور نہ تراشی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو،“ (احبار۔ باب 26، آیت 1)۔

تانا نہ ہو کہ تم بگڑ کر کسی شکل یا صورت کی کھودی ہوئی مورت اپنے لیے بنا لو جس کی شبیہ کسی مرد یا عورت یا زمین کے کسی حیوان یا ہوا میں اڑنے والے کسی پرند یا زمین میں رینگنے والے جاندار یا مچھلی سے جو زمین کے

نیچے پانی میں رہتی ہے ملتی ہو،“ (استثناء، باب 4- آیت 16-18)۔

”لعنت اس آدمی پر جو کاریگری کی صنعت کی طرح کھودی ہوئی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر جو خداوند کے نزدیک مکر وہ ہے اس کو کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے“ (استثناء، باب 27- آیت 15)۔

ان صاف اور صریح احکام کے بعد یہ بات کیسے مانی جا سکتی ہے کہ حضرت سلیمان نے انبیاء اور ملائکہ کی تصویریں یا ان کے مجسمے بنانے کا کام جتوں سے لیا ہو گا اور یہ بات آخر ان یہودیوں کے بیان پر اعتماد کر کے کیسے تسلیم کر لی جائے جو حضرت سلیمان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنی مشرک بیویوں کے عشق میں مبتلا ہو کر بت پرستی کرنے لگے تھے (1- سلاطین - باب 11)۔ تاہم مفسرین نے تو بنی اسرائیل کی یہ روایات نقل کرنے کے ساتھ اس امر کی صراحت کر دی تھی کہ شریعت محمدیہ یہ فعل حرام ہے اس لیے اب کوئی شخص حضرت سلیمان کی پیروی میں تصویریں اور مجسمے بنانے کا مجاز نہیں ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے بعض لوگوں نے جو اہل مغرب کی تقلید میں مصوری و بت تراشی کو حلال کرنا چاہتے ہیں، قرآن مجید کی اس آیت کو دلیل ٹھہرا لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ایک پیغمبر نے یہ کام کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کتاب میں اس کے اس فعل کا ذکر کیا ہے اور اس پر کسی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں فرمایا ہے تو اسے لازماً حلال ہی ہونا چاہیے۔ ان مقلدین مغرب کا یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے۔ اول یہ کہ لفظ تماثل جو قرآن مجید میں استعمال کیا گیا ہے، انسانی اور حیوانی تصاویر کے معنی میں صریح نہیں ہے، بلکہ اس کا اطلاق غیر جاندار اشیاء کی تصویروں پر بھی ہوتا ہے، اس لیے محض اس لفظ کے سہارے حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ قرآن کی رو سے انسانی اور حیوانی تصاویر حلال ہیں۔ دوسرے یہ کہ نہایت کثیر التعداد اور قومی الاسناد اور متواتر المعنی احادیث سے ہی ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی روح اشیاء کی تصویریں بنانے اور رکھنے کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ اس معاملہ میں جو ارشادات حضور سے ثابت ہیں اور جو آثار اکابر صحابہ سے منقول ہوئے انہیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

1- عن عائشہ أم المومنین ان ام جیبہ وام سلمہ ذکرتا کنیستہ رأینہا بالحیثہ فیہا تصاویر فذکرتا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ان اولئک اذا کان فیہم الرجل الصالح فمات بنو اعلیٰ قبرہ مسجد او صور وافیہ تلک اصویر فیہ تلک صور فاولئک شرار الخلق عند اللہ یوم القیمتہ (بخاری، کتاب المساجد)۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ حضرت ام حبیبہ اور حضرت ام سلمہ نے حبش میں ایک کنیہ دیکھا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ اس کا ذکر انہوں نے بنی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ حضور نے فرمایا ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب ان میں کوئی صالح شخص ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد وہ اس کی قبر پر ایک عبادت گاہ بناتے اور اس میں یہ تصویریں بنا لیا کرتے تھے۔ یہ لوگ قیامت کے روز اللہ کے نزدیک بدترین خلاق قرار پائیں گے۔

2- عن ابی حنیفہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن المصور (بخاری، کتاب البیوع، کتاب الطلاق و کتاب اللباس)۔ ابو حنیفہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصور پر لعنت فرمائی ہے۔

3- عن ابی زرعہ قال دخلت مع ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ داراً بالمدينة فرأی اعلاها مصوراً یصور قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ومن اظلم من ذہب یخلق کخلقہ فلیخلقوا حبه و لیخلقوا ذرۃ (بخاری، کتاب اللباس)۔ مسند احمد اور مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ مروان کا گھر تھا۔

ابو زرعہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابو ہریرہ کے ساتھ ایک مکان میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مکان کے اوپر ایک مصور تصویریں بنا رہا ہے۔ اس پر حضرت ابو ہریرہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو میری تخلیق کے مانند تخلیق کی کوشش کرے۔ یہ لوگ ایک دانہ یا ایک چھوٹی تو بنا کر دکھائیں۔

4- عن ابی محمد الہذلی عن علی قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی جنازۃ فقال ایکم ینطلق الی المدینۃ فلا یدع بہا وثناً الا کسرہ ولا قبراً الا سوّاه ولا صورۃ الا لطحها۔ فقال رجل انا یا رسول اللہ فانطلق فہاب اهل المدینہ۔ فرجع۔ فقال علی انا انطلق یا رسول اللہ۔ قال فانطلق، فانطلق ثم رجع۔ فقال یا رسول اللہ لم ادع بہا وثناً الا کسرتہ ولا قبراً الا سویتہ ولا صورۃ الا لطحتها۔ ثم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من عاد لصنعة شیء من ہذا فقد کفر بما انزل علی محمد (مسند احمد)۔ مسلم، کتاب الجنائز اور نسائی کتاب الجنائز میں بھی اس مضمون کی ایک حدیث منقول ہوئی ہے۔

ابو محمد ہذلی حضرت علی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے میں شریک



تھے۔ آپ نے فرمایا تم لوگوں میں سے کون ہے جو جا کر مدینہ میں کوئی بت نہ چھوڑے جسے توڑ نہ دے اور کوئی قبر نہ چھوڑے جسے زمین کے برابر نہ کر دے اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جسے مٹا نہ دے۔ ایک شخص نے عرض کیا میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ چنانچہ وہ گیا مگر اہل مدینہ کے خوف سے یہ کام کیے بغیر پلٹ آیا۔ پھر حضرت علیؑ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں جاتا ہوں۔ حضور مسلم نے فرمایا اچھا تم جاؤ۔ حضرت علیؑ گئے اور واپس آکر انہوں نے عرض کیا میں نے کوئی بت نہیں چھوڑا جسے توڑ نہ دیا ہو، اور کوئی قبر نہیں چھوڑی جسے زمین کے برابر نہ کر دیا ہو اور کوئی تصویر نہ چھوڑی جسے مٹا نہ دیا ہو۔ اس پر حضور مسلم نے فرمایا، اب اگر کسی شخص نے ان چیزوں میں سے کوئی چیز بنائی تو اس نے اس تعلیم سے کفر کیا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے۔

5- عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم - ومن صور صورة عذب کلف ان ینفخ فیہا ولیس بنا فح (بخاری۔ کتاب التعمیر۔ ترمذی، ابواب للباس، نسائی۔ کتاب الزبیۃ۔ مسند احمد)۔

ابن عباس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ اور جس شخص نے تصویر بنائی اسے عذاب دیا جائے گا اور مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے اور وہ نہ پھونک سکے گا۔

6- عن سعید بن ابی الحسن قال کنت عند ابن عباس رضی اللہ عنہما اذا تاہ رجل فقال یا ابا عباس انی انسان انما معیشتی من صنعة یدی وانی اسنع ہذہ اتصاویر۔ فقال ابن عباس لا احد تک الا ما سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول۔ سمعته یقول من صور صورة فان اللہ معذ بہ حتی ینفخ فیہا الروح ولیس بنا فح فیہا ابداء۔ فر بالرجل ربوۃ شدیدة واصفر وجہہ۔ فقال ویحک ان ابیت الا ان تصنع فعلیک بہذا الشجر کل شئی لیس فیہ روح (بخاری، کتاب البیوع۔ مسلم، کتاب اللباس۔ نسائی، کتاب الزبیۃ۔ مسند احمد)۔

سعید بن ابی الحسن کہتے ہیں کہ میں ابن عباسؓ کے پاس بیٹھا تھا۔ اتنے میں ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ اے ابو عباس میں ایک ایسا شخص ہوں جو اپنے ہاتھ سے روزی کھاتا ہے اور میرا روزگار یہ تصویریں بنانا ہے۔ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ میں تم سے وہی بات کہوں گا جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنی ہے۔ میں نے حضور مسلم سے یہ بات سنی ہے کہ جو شخص تصویر بنائے گا اللہ اسے عذاب دے گا اور اسے نہ چھوڑے گا جب تک وہ اس میں روح نہ پھونکے، اور وہ کبھی روح نہ پھونک سکے گا۔ یہ بات سن کر

وہ شخص سخت برا فروختہ ہوا اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس پر ابن عباسؓ نے کہا بندہ خدا، اگر تجھے تصویر بنانی ہے تو اس درخت کی بنا، یا کسی ایسی چیز کی بنا جس میں روح نہ ہو۔

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اشد الناس عذابا عند اللہ یوم القیامۃ المصورون (بخاری، کتاب اللباس، مسلم، کتاب اللباس، نسائی، کتاب الزینہ، مسند احمد)۔

7- عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز اللہ کے ہاں سخت ترین سزا پانے والے مصور ہوں گے۔

8- عن عبد اللہ بن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الذین یصنعون ہذہ الصور یعذبون یوم القیامہ یقال لہم احواما خلقتہم (بخاری، کتاب اللباس - مسلم، کتاب اللباس - نسائی، کتاب الزینہ - مسند احمد)۔

عبد اللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں ان کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اسے زندہ کرو۔

9- عن عائشہ رضی اللہ عنہا انھا اشترت نمرقہ فیہا تصاویر فقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالباب ولم یدخل فقلت اتوب الی اللہ ثم اذنبت قال ما ہذہ النمرقہ قلت لتجلس علیہا وتوسدھا قال ان اصحاب ہذہ الصور یعذبون یوم القیامہ یقال لہم احواما خلقتہم والملائکہ لا تدخل بیتا فیہ الصورۃ۔ (بخاری، کتاب اللباس، مسلم، کتاب اللباس - نسائی، کتاب الزینہ، ابن ماجہ، کتاب التجارات - موطا، کتاب الاستیزان)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک تنکیہ خریدا جس میں تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دروازے ہی میں کھڑے ہو گئے۔ اندر داخل نہ ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ میں خدا سے توبہ کرتی ہوں ہر اس گناہ پر جو میں نے کیا ہو۔ حضورؐ نے فرمایا یہ تنکیہ کیسا ہے؟ میں نے عرض کیا یہ اس غرض کے لیے ہے کہ آپ یہاں تشریف رکھیں اور اس پر ٹیک لگائیں۔ فرمایا ان تصویروں کے بنانے والوں کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اس کو زندہ کرو۔ اور ملائکہ (یعنی ملائکہ رحمت) کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں۔

10- عن عائشہ قالت دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا متسترۃ بقمرام فیہ صورۃ فتلوّن وجہہ ثم

تناول الستر هتکے ثم قال ان من اشد الناس عذاباً يوم القيامة الذين يشبهون بخلق الله (مسلم، کتاب اللباس بخاری، کتاب اللباس - نسائی، کتاب الزینة)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے اور میں نے ایک پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویر تھی۔ آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، پھر آپ نے اس پردے کو لے کر پھاڑ ڈالا اور فرمایا قیامت کے روز سخت ترین عذاب جن لوگوں کو دیا جائے گا ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کی تخلیق کے مانند تخلیق کی کوشش کرتے ہیں۔

عن عائشہ قالت قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم من سفر وقد سترت على بابي درنو كأفیه الخيل ذوات الاجنحة فامرني فنزعته (مسلم کتاب اللباس، نسائی، کتاب الزینة)۔

11- حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے اور میں نے اپنے دروازے پر ایک پردہ لٹکا رکھا تھا، جس میں پر دار گھوڑوں کی تصویریں تھیں۔ حضور سلم نے حکم دیا کہ اسے اتار دو اور میں نے اتاریا۔

12- عن جابر قال فھی رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الصورة في البيت وھی ان يصنع ذالك۔ (ترمذی، ابواب اللباس)۔

جابر بن عبد سلم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا کہ گھر میں تصویر رکھی جائے اور اس سے بھی منع فرما دیا کہ کوئی شخص تصویر بنائے۔

13- عن ابن عباس عن ابي طلحة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال لا تدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا صورة۔ (بخاری کتاب اللباس)۔

ابن عباس ابو طلحہ انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ملائکہ (یعنی ملائکہ رحمت) کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا پلا ہوا ہو اور نہ ایسے گھر میں جس میں تصویر ہو۔

14- عن عبد الله بن عمر قال وعد النبي صلى الله عليه وسلم جبريل فرأث عليه حتى اشتد على النبي صلى الله عليه وسلم فلقية فشكا اليه ما وجد فقال له انا لاندخل بيتا فيه صورة ولا كلب۔ (بخاری، کتاب اللباس)۔ اس مضمون



کی متعدد روایات بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، امام مالک اور امام احمد نے متعدد صحابہ سے نقل کی ہیں۔

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبریلؑ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کا وعدہ کیا مگر بہت دیر لگ گئی اور وہ نہ آئے۔ حضور مسلم کو اس سے پریشانی ہوئی اور آپ گھر سے نکلے تو وہ مل گئے۔ آپ مسلم نے ان سے شکایت کی تو انہوں نے کہا ہم کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو یا تصویر ہو۔

ان روایات کے مقابلے میں کچھ روایتیں ایسی پیش کی جاتی ہیں جن میں تصاویر کے معاملہ میں رخصت پائی جاتی ہے مثلاً ابو طلحہ انصاری کی یہ روایت کہ جس کپڑے میں تصویر کڑھی ہوئی ہو اس کا پردہ لٹکانے کی اجازت ہے۔ (بخاری، کتاب اللباس) اور حضرت عائشہ کی یہ روایت کہ تصویر دار کپڑے کو پھاڑ کر جب انہوں نے گدا

بنالیا تو حضور نے اسے بچھانے سے منع نہ فرمایا۔ (مسلم، کتاب اللباس) اور سالم بن عبداللہ بن عمر کی روایت کہ ممانعت اس تصویر کی ہے جو نمایاں مقام پر نصب کی گئی ہو، نہ کہ اس تصویر کی جو فرش کے طور پر بچھا دی گئی ہو (مسند احمد)۔ لیکن ان میں سے کوئی حدیث بھی دراصل ان احادیث کی تردید نہیں کرتی جو اوپر نقل کی گئی

ہیں۔ جہاں تک تصویر بنانے کا تعلق ہے اس کا جواز ان میں سے کسی حدیث سے بھی نہیں نکلتا۔ یہ احادیث صرف اس مسئلے سے بحث کرتی ہیں کہ اگر کسی کپڑے پر تصویر بنی ہوئی ہو اور آدمی اس کو لے چکا ہو تو کیا کرے۔

اس باب میں ابو طلحہ انصاری والی روایت کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ وہ بکثرت دوسری صحیح احادیث سے ٹکراتی ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر دار کپڑا لٹکانے سے نہ صرف منع فرمایا ہے بلکہ اسے پھاڑ دیا ہے۔ نیز خود حضرت ابو طلحہ کا اپنا عمل جو ترمذی اور موطا میں منقول ہوا ہے وہ یہ ہے کہ تصویر

دار پردہ تو درکنار وہ ایسا فرش بچھانے میں بھی کراہت محسوس کرتے تھے جس میں تصاویر ہوں۔ میں حضرت عائشہ اور سالم بن عبداللہ کی روایات تو ان سے صرف اتنا جواز نکلتا ہے کہ اگر تصویر احترام کی جگہ پر نہ ہو بلکہ ذلت کے ساتھ فرش میں رکھی جائے اور اسے پامال کیا جائے تو وہ قابل برداشت ہے۔ ان احادیث سے آخر

اس پوری ثقافت کا جواز کیسے نکالا جاسکتا ہے جو تصویر کشی اور مجسمہ سازی کے آرٹ کو تہذیب انسانی کا قابل فخر

کمال قرار دیتی ہے اور اسے مسلمانوں میں رواج دینا چاہتی ہے۔

تصاویر کے معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر کار امت کے لیے جو ضابطہ چھوڑا ہے اس کا پتہ اکابر صحابہ کے اس طرز عمل سے چلتا ہے جو انہوں نے اس باب میں اختیار کیا۔ اسلام میں یہ اصول مسلم ہے کہ معتبر اسلامی ضابطہ وہی ہے جو تمام تدریجی احکام اور ابتدائی رخصتوں کے بعد حضور مسلم نے اپنے آخر عہد میں مقرر کر دیا ہو۔ اور حضور مسلم کے بعد اکابر صحابہ کا کسی طریقے پر عمل درآمد کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسی طریقے پر حضور نے امت کو چھوڑا تھا۔ اب دیکھیے کہ تصویروں کے ساتھ اس مقدس گروہ کا کیا برتاؤ تھا۔

قال عمر رضی اللہ عنہ انا لاندخل کنائسکم کن اجل التماثل التي فیہا الصُّور۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ)۔  
حضرت عمر نے عیسائیوں سے کہا کہ ہم تمہارے کئیوں میں اس لیے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں تصویریں ہیں۔

کان ابن عباس یصلی فی بیعة الابیعة فیہا تماثل (بخاری، کتاب الصلوٰۃ)۔  
ابن عباسؓ گرجا میں نماز پڑھ لیتے تھے، مگر کسی ایسے گرجا میں نہیں جس میں تصویریں ہوں۔

عن ابی الھیاج الاسدی قال لی علی الابعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تدع تمثالاً الاطمستہ ولا قبراً مشرفاً الا سویتہ ولا صورة الا طمستہا۔ (مسلم، کتاب الجنازہ۔ نسائی، کتاب الجنازہ)۔  
ابو الھیاج اسدی کہتے ہیں کہ حضرت علی نے مجھ سے کہا کیا نہ بھیجوں میں تم کو اس مہم پر جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا؟ اور وہ یہ کہ تم کوئی مجسمہ نہ چھوڑو جسے توڑ نہ دو، اور کوئی اونچی قبر نہ چھوڑو جسے زمین کے برابر نہ کر دو اور کوئی تصویر نہ چھوڑو جسے مٹا نہ دو۔

عن حنش الکنانی عن علی انه بعث عامل شرطته فقال له اتدہری علی ما ابعثک؟ علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تحت کل صورة وان اسوی کل قبر (مسند احمد)۔

حنش الکنانی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی پولیس کے کو تو ال سے کہا کہ تم جانتے ہو میں کس مہم پر تمہیں بھیج رہا ہوں؟ اس مہم پر جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا۔ یہ کہ میں ہر تصویر کو مٹا دوں اور ہر قبر کو زمین کے برابر کر دوں۔

اسی ثابت شدہ اسلامی ضابطہ کو فقہائے اسلام نے تسلیم کیا ہے اور اسے قانون اسلامی کی ایک دفعہ قرار دیا

ہے۔ چنانچہ علامہ بدرالدین عینی توضیح کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"ہمارے اصحاب (یعنی فقہائے احناف) اور دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ کسی جاندار چیز کی تصویر بنانا حرام ہی نہیں، سخت حرام اور کبیرہ گناہوں میں سے ہے، خواہ بنانے والے نے اسے کسی ایسے استعمال کے لیے بنایا ہو جس میں اس کی تذلیل ہو، یا کسی دوسری غرض کے لیے۔ ہر حالت میں تصویر کشی حرام ہے کیوں کہ اس میں اللہ کی تخلیق سے مشابہت ہے۔ اسی طرح تصویر خواہ کپڑے میں ہو یا فرش میں یا دینار یا درہم یا پیسے میں، یا کسی برتن میں یا دیوار میں، بہر حال اس کا بنانا حرام ہے۔ البتہ جاندار کے سوا کسی دوسری چیز مثلاً درخت وغیرہ کی تصویر بنانا حرام نہیں ہے۔ ان تمام امور میں تصویر کے سایہ دار ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہی رائے امام مالک، سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ اور دوسرے علماء کی ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ اس سے لڑکیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں۔ مگر امام مالک ان کے خریدنے کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ (عمدة القاری۔ ج 22 ص 70۔ اسی مسلک کو امام ثوری نے شرح مسلم میں زیادہ تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ملاحظہ ہو شرح نووی، مطبوعہ مصر، ج 14۔ ص 81-82)

یہ تو ہے تصویر سازی کا حکم۔ رہا دوسرے کی بنائی ہوئی تصویر کے استعمال کا مسئلہ تو اس کے بارے میں فقہائے اسلام کے مسلک علامہ ابن حجر نے اس طرح نقل کیے ہیں: "مالکی فقیہ ابن عربی کہتے ہیں کہ جس تصویر کا سایہ پڑتا ہو اس کے حرام ہونے پر تو اجماع ہے قطع نظر اس سے کہ وہ تحقیر کے ساتھ رکھی گئی ہو یا نہ۔ اس اجماع سے صرف لڑکیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں۔" ابن عربی یہ بھی کہتے ہیں کہ جس تصویر کا سایہ نہ پڑتا ہو وہ اگر اپنی حالت پر باقی رہے (یعنی آئینہ کی پرچھائیں کی طرح نہ ہو بلکہ چھپی ہوئی تصویر کی طرح ثابت و قائم ہو) تو وہ بھی حرام ہے، خواہ اسے حقارت کے ساتھ رکھا گیا ہو یا نہ۔ البتہ اگر اس کا سر کاٹ دیا گیا ہو یا اس کے اجزاء الگ الگ کر لیے گئے ہوں تو اس کا استعمال جائز ہے۔ امام الحرمین نے ایک مسلک یہ نقل کیا ہے کہ پردے یا تکیہ پر اگر تصویر ہو تو اس کے استعمال کی اجازت ہے، مگر دیوار یا چھت میں جو تصویر لگائی جائے وہ ممنوع ہے کیونکہ اس کا اعزاز ہوگا،

مخلاف اس کے پردے اور تکیے کی تصویر حقارت سے رہے گی۔ ابن ابی شیبہ نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ زمانہ تابعین کے علماء یہ رائے رکھتے تھے کہ فرش اور تکیہ میں تصویر کا ہونا۔ اس کے لیے باعث ذلت



ہے۔ نیز ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اونچی جگہ پر جو تصویر لگائی گئی ہو وہ حرام ہے اور قدموں میں جسے پامال کیا جاتا ہو وہ جائز ہے۔ یہی رائے ابن سیرین، سالم بن عبداللہ، حکمہ بن خالد اور سعید بن جبیر سے بھی منقول ہے۔" (فتح الباری، ج 10، ص 300)۔

اس تفصیل سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں تصاویر کی حرمت کوئی مختلف فیہ یا مشکوک مسئلہ نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات صحابہ کرام کے عمل اور فقہانے اسلام کے متفقہ فتاویٰ کی رو سے ایک مسلم قانون ہے جسے آج بیرونی ثقافتوں سے متاثر لوگوں کی موشگافیاں بدل نہیں سکتیں۔

بعض لوگ فوٹو اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت بجائے خود تصویر کو حرام کرتی ہے نہ کہ تصویر سازی کے کسی خاص طریقے کو۔ فوٹو اور دستی تصویر ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے درمیان جو کچھ بھی فرق ہے وہ طریق تصویر سازی کے لحاظ سے ہے، اور اس لحاظ سے شریعت نے احکام میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام میں تصویر کی حرمت کا حکم محض شرک و بت پرستی کو روکنے کی خاطر دیا گیا تھا، اور اب اس کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لہذا یہ حکم باقی نہ رہنا چاہیے۔ لیکن یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ اول تو احادیث میں کہیں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ تصاویر صرف شرک و بت پرستی کے خطرے سے بچانے کے لیے حرام کی گئی ہیں۔ دوسرے، یہ دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ اب دنیا میں شرک و بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ آج خود برعظیم ہندو پاکستان میں کروڑوں بت پرست مشرکین موجود ہیں، دنیا کے مختلف خطوں میں طرح طرح سے شرک ہو رہا ہے، عیسائی اہل کتاب بھی حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم اور اپنے متعدد اولیاء کی تصاویر اور مجسموں کو پوج رہے ہیں، حتیٰ کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی مخلوق پرستی کی آفتوں سے محفوظ نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف وہ تصویریں ممنوع ہونی چاہئیں جو مشرکانہ نوعیت کی ہیں، یعنی ایسے اشخاص کی تصاویر اور مجسمے جن کو معبود بنا لیا گیا ہو، باقی دوسری تصویروں اور مجسموں کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے دراصل شارع کے احکام وارشادات سے قانون اخذ کرنے کے بجائے آپ ہی اپنے شارع بن بیٹھتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں ہے کہ تصویر صرف ایک شرک وبت پرستی ہی کی موجب نہیں بنتی، بلکہ دنیا میں دوسرے بہت سے فتنوں کی موجب بھی بنتی ہے اور بن رہی ہے۔ تصویر ان بڑے ذرائع میں سے ایک ہے جن سے بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور سیاسی لیڈروں کی عظمت کا سکہ عوام الناس کے دماغوں پر بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تصویر کو دنیا میں شہوانیت پھیلانے کے لیے بھی بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے اور آج یہ فتنہ ہر زمانے سے زیادہ برسر عروج ہے، تصاویر قوموں میں نفرت اور عداوت کے بیج بونے، فساد ڈلوانے اور عام لوگوں کو طرح طرح سے گمراہ کرنے کے لیے بھی بکثرت استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ اور آج سب سے زیادہ استعمال کی جا رہی ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ شارع نے تصویر کی حرمت کا حکم صرف بت پرستی کے استیصال کی خاطر دیا ہے، اصلاً غلط ہے۔ شارع نے مطلقاً جاندار اشیاء کی تصویر کو روکا ہے۔ ہم اگر خود شارع نہیں بلکہ شارع کے متبع ہیں تو ہمیں علی الاطلاق اس سے رک جانا چاہیے۔ ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی علت حکم خود تجویز کر کے اس کے لحاظ سے بعض تصویروں کو حرام اور بعض کو حلال قرار دینے لگیں۔

بعض لوگ چند بظاہر بالکل ”بے ضرر“ قسم کی تصاویر کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ آخر ان میں کیا خطرہ ہے، یہ تو شرک اور شہوانیت اور فساد انگیزی اور سیاسی پروپیگنڈے اور ایسے ہی دوسرے مفسدات سے قطعی پاک ہیں، پھر ان کے ممنوع ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس معاملہ میں لوگ پھر وہی غلطی کرتے ہیں کہ پہلے علت حکم خود تجویز کر لیتے ہیں اور اس کے بعد یہ سوال کرتے ہیں کہ جب فلاں چیز میں یہ علت نہیں پائی جاتی تو وہ کیوں ناجائز ہے۔ علاوہ بریں یہ لوگ اسلامی شریعت کے اس قاعدے کو بھی نہیں سمجھتے کہ وہ حلال اور حرام کے درمیان ایسی دھندلی اور مبہم حد بندیاں قائم نہیں کرتی جن سے آدمی یہ فیصلہ نہ کر سکتا ہو کہ وہ کہاں تک جواز کی حد میں ہے اور کہاں اس حد کو پار کر گیا ہے، بلکہ ایسا واضح خط امتیاز کھینچتی ہے جسے ہر شخص روز روشن کی طرح دیکھ سکتا ہو۔ تصاویر کے درمیان یہ حد بندی قطعی واضح ہے کہ جانداروں کی تصویریں حرام اور بے جان اشیاء کی تصویریں حلال ہیں۔ اس خط امتیاز میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے جسے احکام کی پیروی کرنی ہو وہ صاف صاف جان سکتا ہے کہ اس کے لیے کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز۔ لیکن اگر جانداروں کی تصاویر میں سے

بعض کو جائز اور بعض کو ناجائز ٹھہرایا جاتا تو دونوں قسم کی تصاویر کی کوئی بڑی سے بڑی فہرست بیان کر دینے کے بعد بھی جواز کی سرحد کبھی واضح نہ ہو سکتی اور بے شمار تصویروں کے بارے میں یہ اشتباہ باقی رہ جاتا کہ انہیں حد جواز کے اندر سمجھا جائے یا باہر۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے شراب کے بارے میں اسلام کا یہ حکم کہ اس سے قطعی اجتناب کیا جائے ایک صاف حد قائم کر دیتا ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جاتا کہ اس کی اتنی مقدار استعمال کرنے سے پرہیز کیا جائے جس سے نشہ پیدا ہو تو حلال اور حرام کے درمیان کسی جگہ بھی حد فاصل قائم نہ کی جا سکتی اور کوئی شخص بھی فیصلہ نہ کر سکتا کہ کس حد تک وہ شراب پی سکتا ہے اور کہاں جا کر اسے رک جانا چاہیے۔ (مزید تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو رسائل و مسائل، حصہ اول، ص 152 تا 155)۔

**21\*** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں بہت بڑے پیمانے پر مہمان نوازی ہوتی تھی۔ بڑے بڑے حوض جیسے لگن اس لیے بنائے گئے تھے کہ ان میں لوگوں کے لیے کھانا نکال کر رکھا جائے اور بھاری دیگیں اس لیے بنوائی گئی تھیں کہ ان میں بیک وقت ہزاروں آدمیوں کا کھانا پک سکے۔

**22\*** یعنی شکر گزار بندوں کی طرح کام کرو۔ جو شخص نعمت دینے والے کا احسان محض زبان سے مانتا ہو، مگر اس کی نعمتوں کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کرتا ہو، اس کا محض زبانی شکر یہ بے معنی ہے۔ اصل شکر گزار بندہ وہی ہے جو زبان سے بھی نعمت کا اعتراف کرے، اور اس کے ساتھ منعم کی عطا کردہ نعمتوں سے وہی کام بھی لے جو منعم کی مرضی کے مطابق ہو۔

پھر جب ہم نے حکم صادر کیا اسکے لئے موت کا  
تو نہ پتہ دیا ان کو اسکی موت کا مگر زمین کے  
ریٹنگنے والے کیرے نے جو کھاتا رہا اسکے عصا کو۔  
پھر جب وہ گر پڑا تب حقیقت کھلی جنات پر <sup>\*23</sup>  
کہ اگر وہ جانتے ہوتے غیب تو نہ بتلا رہتے وہ  
عذاب میں ذلت کے۔ <sup>\*24</sup>

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ  
عَلَى مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ  
مِنْ سَاتِهِ فَلَمَّا خَرَ تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ أَنْ  
لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبِ مَا لَبِثُوا فِي  
الْعَذَابِ الْمُهِينِ <sup>ط</sup>



**23\*** اصل لفظ میں تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ۔۔ اس فقرے کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو ہم نے اوپر متن میں کیا ہے۔ اور دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنوں کا حال کھل گیا یا منکشف ہو گیا۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ خود جنوں کو پتہ چل گیا کہ غیب دانی کے متعلق ان کا زعم غلط ہے۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ عام لوگ جو جنوں کو غیب داں سمجھتے تھے ان پر یہ راز فاش ہو گیا کہ وہ علم غیب نہیں رکھتے۔

**24\*** موجودہ زمانے کے بعض مفسرین نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ حضرت سلیمان کا بیٹا رَحْبَعَام چونکہ نالائق اور عیش پسند تھا اور خوشامدی مصاحبوں میں گھرا ہوا تھا، اس لیے اپنے جلیل القدر والد کی وفات کے بعد وہ اس بار عظیم کو نہ سنبھال سکا جو اس پر آپڑا تھا۔ اس کی جانشینی کے تھوڑی مدت بعد ہی سلطنت کا قصر دھڑام سے زمین پر آ رہا اور گرد و پیش کے جن سرحدی قبائل (یعنی جنوں) کو حضرت سلیمان نے اپنی قوت قاہرہ سے خادم بنا رکھا تھا وہ سب قابو سے نکل گئے۔ لیکن یہ تاویل کسی طرح بھی قرآن کے الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآن کے الفاظ جو نقشہ ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان پر ایسی حالت میں موت طاری ہوئی جبکہ وہ ایک عصا کے سہارے کھڑے یا بیٹھے تھے۔ اس عصا کی وجہ سے ان کا بے جان جسم اپنی جگہ قائم رہا اور جن یہ سمجھتے ہوئے ان کی خدمت میں لگے رہے کہ وہ زندہ ہیں۔ آخر کار جب عصا کو گھن لگ گیا اور وہ اندر سے کھوکھلا ہو گیا تو ان کا جسم زمین پر گر گیا اور اس وقت جنوں کو پتہ چلا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس صاف اور صریح بیان واقعہ کو آخر یہ معنی پہنانے کی معقول وجہ ہے کہ گھن سے مراد حضرت سلیمان کے بیٹے کی نالائقی ہے، اور عصا سے مراد ان کا اقتدار ہے، اور ان کے مردہ جسم کے گر جانے سے مراد ان کی سلطنت کا پارہ پارہ ہو جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اگر یہی مضمون بیان کرنا ہوتا تو کیا اس کے لیے عربی مسبین میں الفاظ موجود نہ تھے کہ اس ہیر پھیر کے ساتھ اسے بیان کیا جاتا؟ یہ پہیلیوں کی زبان آخر قرآن مجید میں کہاں استعمال کی گئی ہے؟ اور اس زمانے کے عام عرب جو اس کلام کے اولین مخاطب تھے، یہ پہیلی کیسے بوجھ سکتے تھے؟

پھر اس تاویل کا سب سے زیادہ عجیب حصہ یہ ہے کہ اس میں جنوں سے مراد وہ سرحدی قبائل لیے گئے ہیں جنہیں حضرت سلیمان نے اپنی خدمت میں لگا رکھا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان قبائل میں سے کون غیب دانی

کا مدعی تھا اور کس کو مشرکین غیب داں سمجھتے تھے؟ آیت کے آخری الفاظ کو اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر پڑھے تو وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جن سے مراد یہاں لازماً کوئی ایسا گروہ ہے جو یا تو خود غیب دانی کا دعویٰ رکھتا تھا، یا لوگ اس کو غیب داں سمجھتے تھے، اور اس گروہ کے غیب سے ناواقف ہونے کا راز اس واقعہ نے فاش کر دیا کہ وہ حضرت سلیمانؑ کو زندہ سمجھتے ہوئے خدمت میں لگے رہے، حالانکہ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ قرآن مجید کا یہ بیان اس کے لیے کافی تھا کہ ایک ایسا ایماندار آدمی اس کو دیکھ کر اپنے اس خیال پر نظر ثانی کر لیتا کہ جن سے مراد سرحدی قبائل ہیں۔ لیکن جو لوگ مادہ پرست دنیا کے سامنے جن نامی ایک پوشیدہ مخلوق کا وجود تسلیم کرتے ہوئے شرماتے ہیں وہ قرآن کی اس تصریح کے باوجود اپنی تاویل پر مصر ہیں۔

قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ مشرکین عرب جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے تھے، انہیں اللہ کی اولاد سمجھتے تھے اور ان سے پناہ مانگا کرتے تھے:

وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ - (الانعام، 100)۔

اور انہوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا ہے۔

وَجَعَلُوا ابْنَةَ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا - (الصّٰفّٰت - 158)۔

اور انہوں نے اللہ کے اور جنوں کے درمیان نسبی تعلق تجویز کر لیا۔

وَ اِنَّهٗ كَانَ رِجَالٍ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ - (الجن - 6)۔

اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

انہی عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ وہ جنوں کو عالم الغیب سمجھتے تھے اور غیب کی باتیں جاننے کے لیے ان کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ یہاں اسی عقیدے کی تردید کے لیے یہ واقعہ سنا رہا ہے اور اس سے مقصود کفار عرب کو یہ احساس دلانا ہے کہ تم لوگ خواہ مخواہ جاہلیت کے غلط عقائد پر اصرار کیے چلے جا رہے ہو حالانکہ تمہارے یہ عقائد بالکل بے بنیاد ہیں (مزید توضیح کے لیے آگے حاشیہ نمبر 63 ملاحظہ ہو)۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَنِ  
بلاشبہ تمہی سب کے لئے <sup>25</sup>\* انکی بستی میں ایک

نشانی - \*26 دو باغ \*27 داہنی طرف اور بائیں  
 طرف۔ کھاؤ رزق میں سے اپنے رب کے اور  
 شکر کرتے رہو اس کا۔ ایک شہر پاکیزہ اور رب  
 بخشنے والا۔

عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ كُلُوا مِنْ رِزْقِ  
 رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلَدًا طَيِّبَةً وَ  
 رَبُّ غَفُورٌ رَحِيمٌ

\*25 سلسلہ بیان کو سمجھنے کے لیے رکوع اول کے مضمون کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفار عرب آخرت کی آمد کو بعید از عقل سمجھتے تھے۔ اور جو رسولِ مسلم اس عقیدے کو پیش کر رہا تھا اس کے متعلق کھلم کھلا یہ کہہ رہے تھے کہ ایسی عجیب باتیں کرنے والا آدمی یا تو مجنون ہو سکتا ہے، یا پھر وہ جان بوجھ کر افترا پردازی کر رہا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پہلے چند عقلی دلائل ارشاد فرمائے جن کی تشریح ہم حاشی نمبر 7-8-12 میں کر چکے ہیں۔ اس کے بعد رکوع دوم میں حضرت داؤد و سلیمان کا قصہ اور پھر سب کا قصہ ایک تاریخی دلیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس سے مقصود یہ حقیقت ذہن نشین کرنا ہے کہ رونے زمین پر خود نوع انسانی کی اپنی سرگزشت قانونِ مکافات کی شہادت دے رہی ہے۔ انسان اپنی تاریخ کو غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگرہ نہیں ہے جس کا سارا کارخانہ اندھا دھند چل رہا ہو بلکہ اس پر ایک سمیع و بصیر خدا فرمانروائی کر رہا ہے جو شکر کی راہ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ایک معاملہ کرتا ہے اور ناشکری و کافر نعمت کی راہ چلنے والوں کے ساتھ بالکل ہی ایک دوسرا معاملہ فرماتا ہے۔ کوئی سبق لینا چاہے تو اسی تاریخ سے یہ سبق لے سکتا ہے کہ جس خدا کی سلطنت کا یہ مزاج ہے اس کی خدائی میں نیکی اور بدی کا انجام کبھی یکساں نہیں ہو سکتا۔ اس کے عدل و انصاف کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب نیکی کا پورا اجر اور بدی کا پورا بدلہ دیا جائے۔

\*26 یعنی اس امر کی نشانی کہ جو کچھ ان کو میسر ہے وہ کسی کا عطیہ ہے نہ کہ ان کا اپنا آفریدہ۔ اور اس امر کی نشانی کہ ان کے بندگی و عبادت اور شکر و سپاس کا مستحق وہ خدا ہے جس نے ان کو یہ نعمتیں دی ہیں نہ کہ وہ جن کا کوئی حصہ ان نعمتوں کی بخشش میں نہیں ہے۔ اور اس امر کی نشانی کہ ان کی دولت لازوال نہیں ہے بلکہ جس طرح آئی ہے اسی طرح جا بھی سکتی ہے۔



27\* اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پورے ملک میں بس دوہی باغ تھے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ سبکی پوری سرزمین گلزار بنی ہوئی تھی۔ آدمی جہاں بھی کھڑا ہوتا اسے اپنے دائیں جانب بھی باغ نظر آتا اور بائیں جانب بھی۔

تو منہ پھیر لیا انہوں نے 28\* پس بھیج دیا ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب 29\* اور بدل دیا ہم نے انکے دونوں باغوں کو ایسے دو باغوں سے جنکے پھل تھے بدمزہ اور جھاؤ کے پیڑ اور کچھ بیریاں تھوڑی سی۔ 30\*

فَاعْرَضُوا فَاٰرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ  
وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتِ اٰكُلٍ  
خَمْطٍ وَّاَثَلٍ وَشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ  
قَلِيْلٍ

28\* یعنی بندگی و شکر گزاری کے بجائے انہوں نے نافرمانی و نیک حرامی کی روش اختیار کر لی۔

29\* اصل میں لفظ سَيْلُ الْعَرِمِ استعمال کیا گیا ہے۔ عرم جنوبی عرب کی زبان کے لفظ عرمن سے ماخوذ ہے جس کے معنی ”بند“ کے ہیں۔ یمن کے کھنڈروں میں جو قدیم کتبات موجودہ زمانے میں دستیاب ہوئے ہیں ان میں یہ لفظ اس معنی میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً 542ء یا 543ء کا ایک کتبہ جو یمن کے حبشی گورنر ابرہہ نے سدّ مارب کی مرمت کرانے کے بعد نصب کرایا تھا اس میں وہ اس لفظ کو بار بار بند کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ لہذا سیل العرم سے مراد وہ سیلاب ہے جو کسی بند کے ٹوٹنے سے آئے۔

30\* یعنی سیل العرم کے آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا علاقہ برباد ہو گیا۔ سب کے لوگوں نے پہاڑوں کے درمیان بند باندھ باندھ کر جو نہریں جاری کی تھیں وہ سب ختم ہو گئیں اور آب پاشی کا پورا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اس کے بعد وہی علاقہ جو کبھی جنت نظیر بنا ہوا تھا خود رو جنگلی درختوں سے بھر گیا اور اس میں کھانے کے قابل اگر کوئی چیز باقی رہ گئی تو وہ محض جھاڑی بوٹی کے پیر تھے۔

یہ بدلہ دیا ہم نے انکو اسلئے کہ ناشکری کی انہوں نے اور نہیں بدلہ دیتے ہم مگر ناشکروں کو۔

ذٰلِكَ جَزٰیْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۗ وَ هَلْ  
نُجْزِيْ اِلَّا الْكَفُوْرَ

اور بنائی تھیں ہم نے درمیان انکے اور بستیوں کے جن میں ہم نے برکت دی تھی (دوسری بستیاں نمایاں طور پر۔ اور ہم نے مقرر کر دی تھی ان میں آدورفت۔<sup>31</sup> چلتے رہو ان میں رات کو اور دن کو بے خوف۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقَرْىِ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا قَرْىَ ظَاهِرَةً وَ قَدَرْنَا فِيهَا السَّبِيْرَ سَبِيْرًا فِيهَا لِيَالِي وَ اَيَّامًا اَمِنِيْنَ ﴿١٨﴾

**31**\* ”برکت والی بستیوں“ سے مراد شام و فلسطین کا علاقہ ہے جسے قرآن مجید میں عموماً اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الاعراف، آیت 137۔ بنی اسرائیل، آیت 1۔ الانبیاء، آیات 71 و 81)۔ ”نمایاں بستیوں“ سے مراد ہیں ایسی بستیاں جو شاہراہ عام پر واقع ہوں، گوشوں میں چھپی ہوئی نہ ہوں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بستیاں بہت زیادہ فاصلے پر نہ تھیں بلکہ متصل تھیں۔ ایک بستی کے آثار ختم ہونے کے بعد دوسری بستی کے آثار نظر آنے لگتے تھے۔

سفر کی مسافتوں کو ایک اندازے پر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ یمن سے شام تک کا پورا سفر مسلسل آباد علاقے میں ملے ہوتا تھا جس کی ہر منزل سے دوسری منزل تک کی مسافت معلوم و متعین تھی۔ آباد علاقوں کے سفر اور غیر آباد صحرائی علاقوں کے سفر میں یہی فرق ہوتا ہے۔ صحرا میں مسافر جب تک چاہتا ہے چلتا ہے اور جب تھک جاتا ہے تو کسی جگہ پڑاؤ کر لیتا ہے۔ بخلاف اس کے آباد علاقوں میں راستے کی ایک بستی سے دوسری بستی تک کی مسافت جانی بوجھی اور متعین ہوتی ہے۔ مسافر پہلے سے پروگرام بنا سکتا ہے کہ راستے کے کن کن مقامات پر وہ ٹھیرتا ہوا جائے گا، کہاں دوپہر گزارے گا اور کہاں رات بسر کرے گا۔

تو کہا انہوں نے ہمارے رب دراز کر دے فاصلے ہماری مسافتوں میں<sup>32</sup> اور ظلم کیا انہوں نے اپنی جانوں پر تو بنا دیا ہم نے انہیں داستانیں۔ اور منتشر کر دیا ہم نے انہیں بالکل بکھیر کر۔<sup>33</sup>

فَقَالُوا رَبَّنَا بَعْدُ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَقْنَهُمْ كُلَّ مَزَقٍ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

بیشک اس میں واضح نشانیاں ہیں ہر اسکے لئے  
جو صابر شاکر ہے۔ \*34

**32\*** ضروری نہیں ہے کہ انہوں زبان ہی سے یہ دعا کی ہو۔ دراصل جو شخص بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے وہ گویا زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ خدایا، میں ان نعمتوں کا مستحق نہیں ہوں۔ اور اسی طرح جو قوم اللہ کے فضل سے غلط فائدہ اٹھاتی ہے وہ گویا اپنے رب سے یہ دعا کرتی ہے کہ اے پروردگار، یہ نعمتیں ہم سے سلب کر لے کیونکہ ہم ان کے قابل نہیں ہیں۔

علاوہ بریں رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا (خدایا ہمارے سفر دور دراز کر دے) کے الفاظ سے کچھ یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ شاید سبکی قوم کو اپنی آبادی کی کثرت کھلنے لگی تھی اور دوسری نادان قوموں کی طرح اس نے بھی اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرہ سمجھ کر انسانی نسل کی افزائش کو روکنے کی کوشش کی تھی۔

**33\*** یعنی سبکی قوم ایسی منتشر ہوئی کہ اس کی پراگندگی ضرب المثل ہو گئی۔ آج بھی اہل عرب اگر کسی گروہ کے انتشار کا ذکر کرتے ہیں "تفرقوا ایدی سبا" وہ تو ایسے پراگندہ ہو گئے جیسے سبکی قوم پراگندہ ہوئی تھی۔ "اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب زوال نعمت کا دور شروع ہوا تو سبا کے مختلف قبیلے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر عرب کے مختلف علاقوں میں چلے گئے غسانوں نے اردن اور شام کا رخ کیا اوس و خزرج کے قبیلے یثرب میں جا بسے۔ خزاعہ نے جدے کے قریب تمامہ کے علاقہ میں سکونت اختیار کی۔ ازد کا قبیلہ عمان میں جا کر آباد ہوا۔ نخم اور جذام اور کندہ بھی نکلنے پر مجبور ہوئے۔ حتیٰ کہ "سبا" نام کی کوئی قوم ہی دنیا میں باقی نہ رہی۔ صرف اس کا ذکر افسانوں میں رہ گیا۔

**34\*** اس سیاق و سباق میں صابر و شاکر سے مراد ایسا شخص یا گروہ ہے جو اللہ کی طرف سے نعمتیں پا کر آپے سے باہر نہ ہو جائے، نہ خوشحالی پر پھولے اور نہ اس خدا کو بھول جائے جس نے یہ سب کچھ اسے عطا کیا ہے۔ ایسا انسان ان لوگوں کے حالات سے بہت کچھ سبق لے سکتا ہے جنہوں نے عروج و ترقی کے مواقع پا کر نافرمانی کی روش اختیار کی اور اپنے انجام بد سے دوچار ہو کر رہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ اور یقیناً سچ کر دکھایا انہر شیطان نے اپنا گمان تو



فَاتَّبِعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٠﴾

اتباع کی انہوں نے اسکی سوائے ایک جماعت  
نے مومنوں کی۔ \*35

**35\* تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قدیم زمانے سے قوم سبا میں ایک عنصر موجود تھا جو دوسرے معبودوں کو ماننے کے بجائے خدائے واحد کو مانتا تھا۔ موجودہ زمانے کی اثری تحقیقات کے سلسلے میں یمن کے کھنڈروں سے جو کتبات ملے ہیں ان میں سے بعض اس قلیل عنصر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ 650 قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے کے بعض کتبات بتاتے ہیں کہ مملکت سبا کے متعدد مقامات پر ایسی عبادت گاہیں بنی ہوئی تھیں جو ذسموی یا ذوساموی (یعنی رب السماء) کی عبادت کے لیے مخصوص تھیں۔ بعض مقامات پر اس معبود کا نام ملکن ذسموی (وہ بادشاہ جو آسمانوں کا مالک ہے) لکھا گیا ہے۔ یہ عنصر مسلسل صدیوں تک یمن میں موجود رہا۔ چنانچہ 378ء کے ایک کتبے میں بھی الہ ذوسموی کے نام سے ایک عبادت گاہ کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ پھر 465ء کے ایک کتبے میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں: بنصر و مردا الھن بعل سمین وارضین (یعنی اس خدا کی مدد اور تائید سے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے)۔ اسی زمانہ کے ایک اور کتبے میں جس کی تاریخ 458 قبل مسیح ہے اسی خدا کے لیے رحمان کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ ہیں بردا رحمن (یعنی رحمان کی مدد سے)۔**

اور نہ تھا اس کا ان پر کچھ اختیار مگر یہ کہ ہم معلوم  
کر لیں اسے جو ایمان رکھتا ہے آخرت پر اس سے  
جو اسکے بارے میں شک میں ہے۔ \*36 اور تیرا  
رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ \*37

وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا  
لِيَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ لَمَنَّ هُوَ  
مِنْهَا فِيْ شَكٍّ وَّ رَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ  
حَفِيْظٌ ﴿٢١﴾

**36\* یعنی ابلیس کو یہ طاقت حاصل نہ تھی کہ ان کا ارادہ تو خدا کی فرمانبرداری کرنے کا ہو مگر وہ زبردستی ان کا ہاتھ پکڑا کر انہیں نافرمانی کی راہ پر کھینچ لے گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی قدرت اس کو دی تھی کہ وہ انہیں بہکانے اور ایسے تمام لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لے جو خود اس کی پیروی کرنا چاہیں۔ اور اس اغوا کے مواقع ابلیس کو**

اس لیے عطا کیے گئے تاکہ آخرت کے ماننے والوں اور اس کی آمد میں شک رکھنے والوں کا فرق کھل جائے۔

**37\* قوم سبا کی تاریخ کی طرف یہ اشارات جو قرآن مجید میں کیے گئے ہیں ان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ معلومات بھی ہماری نگاہ میں رہیں جو اس قوم کے متعلق دوسرے تاریخ ذرائع سے فراہم ہوئی ہیں۔**

تاریخ کی رو سے ”سبا“، جنوبی عرب کی ایک بہت بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن عبدالبر اور ترمذی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سبا عرب کے ایک شخص کا نام تھا جس کی نسل سے عرب میں حسب ذیل قبیلے پیدا ہوئے:

كِنْدَه - حَمْر - اَزْد - اَشْعَرِيّين - مَذْحِج - اَثَمَار - جس کی دو شاخیں ہیں خَثْعَم اور بَجِيلَه - عَامِلَه - جُذَام - لَحْم اور غسان۔

بہت قدیم زمانے سے دنیا میں عرب کی اس قوم کا شہرہ تھا۔ 2500 قبل مسیح میں اور کے کتبات اس کا ذکر ساہوم کے نام سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابل اور آشور (اسیریا) کے کتبات میں اور اسی طرح بائبل میں بھی کثرت سے اس کا ذکر آیا ہے، (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو زبور، 72: 15 - یرمیاہ 20: 6 - حدقی ایل 27: 22 - 38: 13 - ایوب 6: 19) یونان و روم کے مورخین و جغرافیہ نویس تھیوفراسٹس (288 قبل مسیح) کے وقت سے مسیح کے بعد کی کئی صدیوں تک مسلسل اس کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں۔

اس کا وطن عرب کا جنوبی کونہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے عروج کا دور گیارہ سو برس قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کا شہرہ آفاق میں پھیل چکا تھا۔ آغاز میں یہ ایک آفتاب پرست قوم تھی۔ پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمان (965 - 926 قبل مسیح) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو اغلب یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت مسلمان ہو گئی تھی۔ لیکن بعد میں نہ معلوم کس وقت اس کے اندر شرک و بت پرستی کا پھر زور ہو گیا اور اس نے اُمقہ (چاند دیوتا)، عَشْتَر (زہرہ) ذات حمیمہ اور ذاب بعدان (سورج دیوی) ہو بس، حر متم یا حریمت اور ایسے ہی دوسرے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ اُمقہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا، اور اس کے بادشاہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کے وکیل کی حیثیت سے اطاعت کا حق دار قرار دیتے۔ یمن میں

بکثرت کتبات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا ملک ان دیوتاؤں، اور خصوصاً اَلْمَقہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا اور ہر اہم واقعہ پر ان کے شکرِیے ادا کیے جاتے تھے۔

آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں یمن سے تقریباً 3 ہزار کتبات فراہم ہوئے ہیں جو اس قوم کی تاریخ پر اہم روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ عربی روایات اور رومی و یونانی تواریخ کی فراہم کردہ معلومات کو اگر جمع کر لیا جائے تو اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ اس کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ ان معلومات کی رو سے اس کی تاریخ کے اہم ادوار حسبِ ذیل ہیں:

1- 650 قبل مسیح سے پہلے کا دور۔ اس زمانے میں ملوکِ سبا کا لقب مکربِ سبا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ لفظ مقرب کا ہم معنی تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بادشاہ انسانوں اور خداؤں کے درمیان اپنے آپ کو واسطہ قرار دیتے تھے، یا دوسرے الفاظ میں یہ کاہن بادشاہ (Priest-Kings) تھے۔ اس زمانے میں ان کا پایہ تخت صراح تھا جس کے کھنڈر آج بھی مارب سے مغرب کی جانب ایک دن کی راہ پر پائے جاتے ہیں اور خربہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی دور میں مارب کے مشہور بند کی بنا رکھی گئی اور وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہوں نے اسے وسیع کیا۔

2- 650 قبل مسیح سے 115 قبل مسیح تک کا دور۔ اس دور میں سبا کے بادشاہوں نے مکرب کا لقب چھوڑ کر ملک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت میں مذہبیت کی جگہ سیاست اور سیکولر ازم کا رنگ غالب ہو گیا اس زمانے میں ملوکِ سبا نے صراح کو چھوڑ کر مارب کو اپنا دار السلطنت بنایا اور اسے غیر معمولی ترقی دی۔ یہ مقام سمندر سے 3900 فیٹ کی بلندی پر صنعاء سے 60 میل جانب مشرق واقع اور آج تک اس کے کھنڈر شہادت دے رہے ہیں کہ یہ کبھی ایک بڑی متمدن قوم کا مرکز تھا۔

3- 115 ق م سے 300 عیسوی تک کا دور۔ اس زمانے میں سبا کی مملکت پر حمیر کا قبیلہ غالب ہو گیا جو قومِ سبا ہی کا ایک قبیلہ تھا اور تعداد میں دوسرے تمام قبائل سے بڑھا ہوا تھا۔ اس دور میں مارب کو اجاڑ کر ریدان پایہ تخت بنایا گیا جو قبیلہ حمیر کا مرکز تھا۔ بعد میں یہ شہر ظفار کے نام سے موسوم ہوا۔ آج کل موجودہ شہر یریم کے قریب ایک مدور پہاڑی پر اس کے کھنڈر ملتے ہیں اور اسی کے قریب علاقہ میں ایک چھوٹا سا قبیلہ حمیر کے



نام سے آباد ہے جسے دیکھ کر کوئی شخص تصور تک نہیں کر سکتا کہ یہ اسی قوم کی یادگار ہے جس کے ڈنکے کھٹی دنیا بھر میں بجتے تھے۔ اسی زمانے میں سلطنت کے ایک حصہ کی حیثیت سے پہلی مرتبہ لفظ یمنیت اور یمنیت کا استعمال ہونا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ یمن اس پورے علاقے کا نام ہو گیا جو عرب کے جنوبی مغربی کونے پر عسیر سے عدن تک اور باب المندب سے حضرموت تک واقع ہے۔ یہی دور ہے جس میں سبائیوں کا زوال شروع ہوا۔

4- 300ء کے بعد سے آغاز اسلام تک کا دور۔ یہ قوم سبا کی تباہی کا دور ہے۔ اس دور میں ان کے ہاں مسلسل خانہ جنگیاں ہوئیں۔ بیرونی قوموں کی مداخلت شروع ہوئی۔ تجارت برباد ہوئی۔ زراعت نے دم توڑا اور آخر کار آزادی تک ختم ہو گئی۔ پہلے ریدانیوں، حمیریوں، اور ہمدانیوں کی باہمی نزاعات سے فائدہ اٹھا کر 340ء سے 378ء تک یمن پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر آزادی تو بحال ہو گئی مگر مارب کے مشہور بند میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے یہاں تک کہ آخر کار 450ء یا 451ء میں بند کے ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر قرآن مجید کی آیات میں کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد ابرہہ کے زمانے تک اس بند کی مسلسل مرتیں ہوتی رہیں، لیکن جو آبادی منتشر ہو چکی تھی وہ پھر جمع نہ ہو سکی اور نہ آب پاشی اور زراعت کا وہ نظام جو درہم برہم ہو چکا تھا، دوبارہ بحال ہو سکا۔ 523ء میں یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے نجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم و ستم برپا کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں اصحاب الأعدود کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں حبش کی عیسائی سلطنت یمن پر انتقاماً حملہ آور ہو گئی اور اس نے سارا ملک فتح کر لیا۔ اس کے بعد یمن کے حبشی وائسرائے ابرہہ نے کعبہ کی مرکزیت ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے کو رومی حبشی اثر میں لانے کے لیے 570ء یا 571ء میں (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے چند روز قبل) مکہ معظمہ پر حملہ کیا اور اس کی پوری فوج پر وہ تباہی آئی جسے قرآن مجید میں اصحاب الفیل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر کار 575ء میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ہوا، اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب 628ء میں ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کر لیا۔

قوم سبا کا عروج دراصل دو بنیادوں پر قائم تھا۔ ایک زراعت۔ دوسرے تجارت۔ زراعت کو انہوں نے آب پاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعہ سے ترقی دی تھی جس کے مثل کوئی دوسرا نظام آب پاشی بابل کے سوا قدیم زمانے میں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ ان کی سر زمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔ بارش کے زمانے میں پہاڑوں

سے برساتی نالے بہ نکلتے تھے۔ انہی نالوں پر سارے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر انہوں نے تالاب بنالیے تھے اور ان سے نہریں نکال نکال کر پورے ملک کو اس طرح سیراب کر دیا تھا کہ قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق ہر طرف ایک باغ ہی باغ نظر آتا تھا۔ اس نظام آب پاشی کا سب سے بڑا مخزن آب وہ تالاب تھا جو شہر مارب کے قریب کوہ بلق کی درمیانی وادی پر بند باندھ کر تیار کیا گیا تھا مگر جب اللہ کی نظر عنایت ان سے پھر گئی تو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ عظیم الشان بند ٹوٹ گیا اور اس سے نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پر بند توڑتا چلا گیا یہاں تک کہ ملک کا پورا نظام آب پاشی تباہ ہو کر رہ گیا۔ پھر کوئی اسے بحال نہ کر سکا۔

تجارت کے لیے اس قوم کو خدا نے بہترین جغرافی مقام عطا کیا تھا جس سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یہی قوم مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بنی رہی۔ ایک طرف ان کے بندرگاہوں میں چین کا ریشم، انڈونیشیا اور مالا بار کے گرم مسالے، ہندوستان کے کپڑے اور تلواریں، مشرقی افریقہ کے زنگی غلام، بندر شتر مرغ کے پر اور ہاتھی دانت پہنچتے تھے اور دوسری طرف یہ ان چیزوں کو مصر اور شام کی منڈیوں میں پہنچاتے تھے جہاں سے روم و یونان تک یہ مال روانہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود ان کے علاقے میں لوبان، عود، عنبر، مشک، مر، قرفہ، قصب الذریرہ، سیلیخہ اور دوسری ان خوشبودار چیزوں کی بڑی پیداوار تھی جنہیں مصر و شام اور روم و یونان کے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

اس عظیم الشان تجارت کے دو بڑے راستے تھے۔ ایک بحری۔ دوسری بری۔ بحری تجارت کا اجارہ ہزار سال تک انہی سبائیوں کے ہاتھ میں تھا، کیونکہ بحر احمر کی موسمی ہواؤں، زیر آب چٹانوں، اور لنگر اندازی کے مقامات کا رازیہی لوگ جانتے تھے اور دوسری کوئی قوم اس خطرناک سمندر میں جہاز چلانے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ اس بحری راستے سے یہ لوگ اردن اور مصر کی بندرگاہوں تک اپنا مال پہنچایا کرتے تھے۔ بری راستے عدن اور حضرموت سے مارب پر جا کر ملتے تھے اور پھر وہاں سے ایک شاہراہ مکہ، جدہ، یثرب، العلاء، تبوک اور ایبہ سے گزرتے ہوئی پڑا تک پہنچتی تھی۔ اس کے بعد ایک راستہ مصر کی طرف اور دوسرا راستہ شام کی طرف جاتا تھا۔ اس بری راستے پر، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے، یمن سے حدود شام تک سبائیوں کی نوآبادیاں مسلسل قائم تھیں اور شب و روز ان کے تجارتی قافلے یہاں سے گزرتے رہتے تھے۔ آج تک ان میں سے

بہت سی نوآبادیوں کے آثار اس علاقے میں موجود ہیں اور وہاں سبائی و حمیری زبان کے کتبات ملے ہیں۔ پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ زمانے میں اس تجارت پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ مشرق اوسط میں جب یونانیوں اور پھر رومیوں کی طاقت و سلطنتیں قائم ہوئیں تو شور مچنا شروع ہو کہ عرب تاجر اپنی اجارہ داری کے باعث مشرق کے اموال تجارت کی من مانی قیمتیں وصول کر رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ ہم خود اس میدان میں آگے بڑھ کر اس تجارت پر قبضہ کریں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے مصر کے یونانی الاصل فرمانروا بطلمیوس ثانی (285-246 قبل مسیح) نے اس قدیم نہر کو پھر سے کھولا جو 17 سو برس پہلے فرعون سوسٹرین نے دریائے نیل کو بحر احمر سے ملانے کے لیے کھدوائی تھی۔ اس نہر کے ذریعہ سے مصر کا بحری بیڑا پہلی مرتبہ بحر احمر میں داخل ہوا۔ لیکن سبائیوں کے مقابلے میں یہ کوشش زیادہ کارگر نہ ہو سکی۔ پھر جب مصر پر روم کا قبضہ ہوا تو رومی زیادہ طاقت ور تجارتی بیڑا بحر احمر میں لے آئے اور اس کی پشت پر انہوں نے ایک جنگی بیڑا بھی لا کر ڈال دیا۔ اس طاقت کا مقابلہ سبائیوں کے بس میں نہ تھا۔ رومیوں نے جگہ جگہ بندرگاہوں پر اپنی تجارتی نوآبادیاں قائم کیں، ان میں جازوں کی ضروریات فراہم کرنے کا انتظام کیا، اور جہاں ممکن ہو وہاں اپنے فوجی دستے بھی رکھ دئے۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آگیا کہ عدن پر رومیوں کا فوجی تسلط قائم ہو گیا۔ اسی سلسلے میں رومی اور حبشی سلطنتوں نے سبائیوں کے مقابلے میں باہم ساز باز بھی کر لیا جس کی بدولت بالآخر اس قوم کی آزادی تک ختم ہو گئی۔

بحری تجارت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد صرف بری تجارت سبائیوں کے پاس رہ گئی تھی۔ مگر بہت سے اسباب نے رفتہ رفتہ اس کی کمر بھی توڑ دی۔ پہلے نبیطوں نے پیڑا سے العلاتک بالائی حجاز اور اردن کی تمام نوآبادیوں سے سبائیوں کو نکال باہر کیا۔ پھر 106ء میں رومیوں نے نبیطی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور حجاز کی سرحد تک شام و اردن کے تمام علاقے ان کے مضبوط ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس کے بعد حبش اور روم کی متحدہ کوشش یہ رہی کہ سبائیوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر ان کی تجارت کو بالکل تباہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر حبشی بار بار یمن میں مداخلت کرتے رہے یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب نے اس قوم کو انتہائی عروج سے گرا کر اس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی معذوب قوم کبھی سر نہیں نکال سکی ہے۔ ایک وقت تھا کہ اس کی دولت کے افسانے سن سن کر



یونان و روم والوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اسٹا ہو لکھتا ہے کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے ہیں، اور ان کے مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت، سونے، چاندی اور جواہر کا کام بنا ہوا ہوتا ہے۔ پلینی کہتا ہے کہ روم اور فارس کی دولت ان کی طرف بھی چلی جا رہی ہے، یہ اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم ہیں، اور ان کا سرسبز و شاداب ملک باغات، کھیتوں اور مویشی سے بھرا ہوا ہے۔ آئی میڈورس کہتا ہے کہ یہ لوگ عیش میں مست ہو رہے ہیں اور جلانے کی لکڑی کے بجائے دار چینی، صندل اور دوسری خوشبو دار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے یونانی مورخین روایت کرتے ہیں کہ ان کے قریب سواحل سے گزرتے ہوئے تجارتی جازوں تک خوشبو کی لپیٹیں پہنچتی ہیں۔ انہوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صنعا کے بلند پہاڑی مقام پر وہ فلک شگاف عمارت (Skyscraper) تعمیر کی جو قصر خندان کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی ہے۔ عرب مورخین کا بیان ہے کہ اس کی 20 منزلیں تھیں اور ہر منزل 36 فیٹ بلند تھی۔ یہ سب کچھ بس اسی وقت تک رہا جب تک اللہ کا فضل ان کے شامل حال رہا۔ آخر کار جب انہوں نے کفران نعمت کی حد کر دی تو رب قدیر کی نظر عنایت ہمیشہ کے لیے ان سے پھر گئی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُونِ  
اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي  
السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ  
فِيهَا مِنْ شَرْكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ  
ظَهِيرٌ ۝۲۲

کہو <sup>38</sup> کہ پکارو انکو جنہیں تم گمان کرتے ہو سوا  
نے اللہ کے <sup>39</sup>۔ نہیں ہیں وہ مالک ذرہ بھر  
چیز کے آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ہے  
انکی ان میں کوئی شرکت۔ اور نہ ہے اس کا  
ان میں سے کوئی مددگار۔

<sup>38</sup> پچھلے دور کو ع میں آخرت کے متعلق مشرکین کے غلط تصورات پر کلام فرمایا گیا تھا۔ اب تقریر کا رخ تردید  
شرک کے مضمون کی طرف پھر رہا ہے۔

<sup>39</sup> یعنی اللہ تو یوں اشخاص اور اقوام اور سلطنتوں کی قسمتیں بناتا اور بگاڑتا ہے، جیسا کہ ابھی تم داؤد و سلیمان

علیہا السلام اور قوم سبا کے ذکر میں سن چکے ہو۔ اب ذرا اپنے ان بناوٹی معبودوں کو پکار کر دیکھ لو، کیا ان میں بھی یہ طاقت ہے کہ کسی کے اقبال کو ادبار سے، یا ادبار کو اقبال سے بدل سکیں؟

اور نہ فائدہ دے گی سفارش اس کے پاس مگر اسکے لئے وہ اجازت بخشے جسکو \*40۔ یہاں تک کہ جب دور ہوگا اضطراب ان (فرشتوں) کے دلوں سے تو کہیں گے کیا فرمایا تمہارے رب نے۔ وہ کہیں گے کہ حق۔ اور وہ ہے عالی رتبہ سب سے بڑا۔ \*41

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ حَتَّىٰ إِذَا فُزِّعَ عَن قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقُّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ﴿٢٣﴾

\*40 یعنی کسی کا خود مالک ہونا، یا ملکیت میں شریک ہونا، یا مددگار خدا ہونا تو درکنار، ساری کائنات میں کوئی ایسی ہستی تک نہیں پائی جاتی جو اللہ تعالیٰ کے حضور کسی کے حق میں بطور خود سفارش کر سکے۔ تم لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو کہ کچھ خدا کے پیارے ایسے ہیں، یا خدا کی خدائی میں کچھ بندے ایسے زور آور ہیں کہ وہ اڑ بیٹھیں تو خدا کو ان کی سفارش ماننی ہی پڑے گی۔ حالانکہ وہاں حال یہ ہے کہ اجازت لیے بغیر کوئی زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جس کو اجازت ملے گی صرف وہی کچھ عرض کر سکے گا۔ اور جس کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت ملے گی اسی کے حق میں عرض معروض کی جا سکے گی۔ (اسلامی عقیدہ شفاعت اور مشرکانہ عقیدہ شفاعت کے فرق کو سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، یونس حواشی 5-23، ہود حواشی 84-106، النحل حواشی 64-79، جلد سوم حاشیہ 86، الانبیاء حاشیہ 27، الحج حاشیہ 125)۔

\*41 یہاں اس وقت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جب قیامت کے روز کوئی سفارش کرنے والا کسی کے حق میں سفارش کی اجازت طلب کرے گا۔ اس نقشے میں یہ کیفیت ہمارے سامنے آتی ہے کہ طلب اجازت کی درخواست بھیجنے کے بعد شافع اور مشفوع دونوں نہایت بے چینی کے علم میں ڈرتے اور کانپتے ہوئے جواب کے منتظر کھڑے ہیں۔ آخر کار جب اوپر سے اجازت آجاتی ہے اور شافع کے چہرے سے مشفوع بھانپ جاتا

ہے کہ معاملہ کچھ اطمینان بخش ہے تو اس کی جان میں جان آتی ہے اور وہ آگے بڑھ کر شافع سے پوچھتا ہے ” کیا جواب آیا،“؟ شافع جواب دیتا ہے کہ ٹھیک ہے، اجازت مل گئی ہے۔ اس بیان سے جو بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ نادانوں! جس بڑے دربار کی شان یہ ہے اس کے متعلق تم کس خیال غام میں پڑے ہوئے ہو کہ وہاں کوئی اپنے زور سے تم کو بخشوالے گا یا کسی کی یہ مجال ہوگی کہ وہاں محل کر بیٹھ جائے اور اللہ سے کہے کہ یہ تو میرے متوسل ہیں، انہیں تو بخشنا ہی پڑے گا۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ  
 الْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ وَ اِنَّا اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى  
 هٰدٰى اَوْ فِى ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٤﴾

کہو کہ کون رزق دیتا ہے تمکو آسمانوں میں اور زمین  
 میں۔ کہو اللہ \*42۔ اور بیشک ہم یا تم ہی یقیناً  
 ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں۔ \*43

\*42 سوال اور جواب کے درمیان ایک لطیف غلا ہے۔ مخاطب مشرکین تھے جو صرف یہی نہیں کہ اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے بلکہ یہ بھی جانتے تھے کہ رزق کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ دوسروں کو خدائی میں شریک ٹھیراتے تھے۔ اب جو ان کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا کہ بتاؤ کون تمہیں آسمان وزمین سے رزق دیتا ہے، تو وہ مشکل میں پڑ گئے۔ اللہ کے سوا کسی کا نام لیتے ہیں تو خود اپنے اور اپنی قوم کے عقیدے کے خلاف بات کہتے ہیں۔ ہٹ دھرمی کی بنا پر ایسی بات کہہ بھی دیں تو ڈرتے ہیں کہ خود اپنی قوم کے لوگ ہی اس کی تردید کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور اگر تسلیم کر لیتے ہیں کہ اللہ ہی رزق دینے والا ہے تو فوراً دوسرا سوال یہ سامنے آجاتا ہے کہ پھر یہ دوسرے کس مرض کی دوا ہیں جنہیں تم نے خدا بنا رکھا ہے؟ رزق تو دے اللہ، اور پوجے جائیں یہ، آخر تمہاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔ اس دو گونہ مشکل میں پڑ کر وہ دم بخود رہ جاتے ہیں۔ نہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہی رزق دینے والا ہے۔ نہ یہ کہتے ہیں کہ کوئی دوسرا معبود رازق ہے۔ پوچھنے والا جب دیکھتا ہے کہ یہ لوگ کچھ نہیں بولتے، تو وہ خود اپنے سوال کا جواب دیتا ہے کہ ”اللہ“۔

\*43 اس فقرے میں حکمت تبلیغ کا ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ اوپر کے سوال و جواب کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ



جو اللہ ہی کی بندگی و پرستش کرتا ہے وہ ہدایت پر ہو اور جو اس کے سوا دوسروں کی بندگی بجالاتا ہے وہ گمراہی میں مبتلا ہو۔ اس بنا پر بظاہر تو اس کے بعد کہنا یہ چاہیے تھا کہ ہم ہدایت پر ہیں اور تم گمراہ ہو۔ لیکن اس طرح دو ٹوک بات کہ دینا حق گوئی کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی درست ہوتا حکمت تبلیغ کے لحاظ سے درست نہ ہوتا۔ کیوں کہ جب کسی شخص کو مخاطب کر کے آپ صاف صاف گمراہ کہہ دیں اور خود اپنے برسر ہدایت ہونے کا دعویٰ کریں تو وہ ضد میں مبتلا ہو جائے گا اور سچائی کے لیے اس کے دل کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ مجرد حق گوئی کے لیے نہیں بھیجے جاتے بلکہ ان کے سپرد یہ کام بھی ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ حکیمانہ طریقے سے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کریں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اس سوال و جواب کے بعد اب تم ان لوگوں سے صاف کہہ دو کہ تم سب گمراہ ہو اور ہدایت پر صرف ہم ہیں۔ اس کے بجائے تلقین یہ فرمائی گئی کہ انہیں اب یوں سمجھاؤ۔ ان سے کہو ہمارے اور تمہارے درمیان یہ فرق تو کھل گیا کہ ہم اسی کو معبود مانتے جو رزق دینے والا ہے، اور تم ان کو معبود بنا رہے ہو جو رزق دینے والے نہیں ہیں۔ اب یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ہم اور تم دونوں بیک وقت راہ راست پر ہوں۔ اس صریح فرق کے ساتھ تو ہم میں سے ایک ہی راہ راست پر ہو سکتا ہے، اور دوسرا لامحالہ گمراہ ٹھہرتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوچنا تمہارا اپنا کام ہے کہ دلیل کس کے برسر ہدایت ہونے کا فیصلہ کر رہی ہے اور کون اس کی رو سے گمراہ ہے۔

کدو نہ پوچھ ہوگی تم سے اسکی جو قصور ہم نے  
کہتے اور نہ ہم سے پوچھ ہوگی اسکی جو تم  
کرتے ہو۔ \*44

قُلْ لَا تَسْأَلُونَنَا وَ لَا  
نُسْأَلُ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢٥﴾

\*44 اوپر کی بات سامعین کو پہلے ہی سوچنے پر مجبور کر چکی تھی۔ اس پر مزید ایک فقرہ یہ فرما دیا گیا تاکہ وہ اور زیادہ تفکر سے کام لیں۔ اس سے ان کو یہ احساس دلایا گیا کہ ہدایت اور گمراہی کے اس معاملے کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنا ہم میں سے ہر ایک کے اپنے مفاد کا تقاضا ہے۔ فرض کرو کہ ہم گمراہ ہیں تو اپنی اس گمراہی کا خمیازہ ہم ہی بھگتیں گے، تم پر اس کی کوئی پکڑ نہ ہوگی۔ اس لیے یہ ہمارے اپنے مفاد کا تقاضا ہے کہ کوئی عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے خوب سوچ لیں کہ کہیں ہم غلط راہ پر تو نہیں جا رہے ہیں۔ اسی طرح تم کو بھی

ہماری کسی غرض کے لیے نہیں بلکہ خود اپنی ہی خیر خواہی کی خاطر ایک عقیدے پر جمنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ کہیں تم کسی باطل نظریے پر تو اپنی زندگی کی ساری پونجی نہیں لگا رہے ہو۔ اس معاملے میں اگر تم نے ٹھوکر کھائی تو تمہارا اپنا ہی نقصان ہوگا، ہمارا کچھ نہ بگڑے گا۔

کہدو کہ جمع کرے گا ہلکو ہمارا رب پھر وہ فیصلہ کر دے گا ہمارے درمیان حق کے ساتھ اور وہ ہے بہتر فیصلہ کرنے والا صاحب علم۔ \*45

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبَّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۗ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ﴿٤٥﴾

\*45 یہ اس معاملہ پر غور کرنے کے لیے آخری اور سب سے بڑا محرک ہے جس کی طرف سامعین کی توجہ دلائی گئی ہے۔ بات اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی کہ اس زندگی میں ہمارے اور تمہارے درمیان حق و باطل کا اختلاف ہے اور ہم میں سے کوئی ایک ہی حق پر ہے، بلکہ اس کے آگے حقیقت نفس الامری یہ بھی ہے کہ ہمیں اور تمہیں، دونوں ہی کو اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اور رب وہ ہے جو حقیقت کو بھی جانتا ہے اور ہم دونوں گروہوں کے حالات سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔ وہاں جا کر نہ صرف اس امر کا فیصلہ ہو گا کہ ہم میں اور تم میں سے حق پر کون تھا اور باطل پر کون۔ بلکہ اس مقدمے کا فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ ہم نے تم پر حق واضح کرنے کے لیے کیا کچھ کیا اور تم نے باطل پرستی کی ضد میں آکر ہماری مخالفت کس کس طرح کی۔

کہدو دکھاؤ مجھے وہ جہنمیں شامل کر رکھا ہے تم نے اسکے ساتھ شریک۔ \*46 ہرگز نہیں۔ بلکہ وہی ہے اللہ غالب حکمت والا۔

قُلْ أَرُونِي الَّذِينَ الَّحَقْتُمْ بِهِ شُرَكَاءَ كَلَّا ۗ بَلْ هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٤٦﴾

\*46 یعنی قبل اس کے کہ تم ان معبودوں کے بھروسے پر اتنا بڑا خطرہ مول لو، ذرا مجھے یہیں بتا دو کہ ان میں کون اتنا زور آور ہے کہ اللہ کی عدالت میں وہ تمہارا حمایتی بن کر اٹھ سکتا ہو اور تمہیں اس کی گرفت سے بچا سکتا ہو۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ  
بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ  
لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢٨﴾

اور نہیں بھیجا ہم نے تمکو مگر تمام انسانوں کے  
لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا لیکن اکثر  
لوگ نہیں جانتے۔ \*47

\*47 یعنی تم صرف اسی شہر، یا اسی ملک، یا اسی زمانے کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے ہو۔ مگر یہ تمہارے ہم عصر اہل وطن تمہاری قدر و منزلت کو نہیں سمجھتے اور ان کو احساس نہیں ہے کہ کیسی عظیم ہستی کی بعثت سے ان کو نوازا گیا ہے۔

یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف اپنے ملک یا اپنے زمانے کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک پوری نوع بشری کے لیے مبعوث فرمانے گئے ہیں، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے۔ مثلاً:

وَأَوْحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَ كُفْرًا بِهِ وَمَنْ بَلَغَ (الانعام 197)۔

اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تم کو متنبہ کروں اور ہر اس شخص کو جسے یہ پہنچے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف - 158)

اے نبی کہ دوائے انسانوں، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء - 107)۔

اور اے نبی، ہم نے نہیں بھیجا تم کو مگر تمام ایمان والوں کے لیے رحمت کے طور پر۔

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (الفرقان - 1)۔

بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے متنبہ کرنے والا ہو۔

یہی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بہت سی احادیث میں مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے۔

بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ (مسند احمد، مرویات ابو موسیٰ اشعری)۔



میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

اَنَا اِنَا فَا رَسَلْتُ اِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ عَامَةً وَكَانَ مِنْ قَبْلِى اِنَّمَا يُرْسَلُ اِلَى الْقَوْمِ (مسند احمد، مرویات عبداللہ بن عمرو بن عاص)۔

میں عمومیت کے ساتھ تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ حالانکہ مجھ سے پہلے جو نبی بھی گزرا ہے وہ اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔

وَكَانَ النَّبِيُّ يَبْعَثُ اِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَبَعَثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً (بخاری و مسلم، من حدیث جابر بن عبداللہ)۔

پہلے ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور میں تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔ بعثت انا والساعة كھتین یعنی اصبعین۔ (بخاری و مسلم)

میری بعثت اور قیامت اس طرح ہیں، یہ فرماتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیاں اٹھائیں۔ مطلب یہ تھا کہ جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی تیسری انگلی حائل نہیں ہے اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان بھی کوئی نبوت نہیں ہے۔ میرے بعد بس قیامت ہی ہے اور قیامت تک میں ہی نبی رہنے والا ہوں۔

اور وہ کہتے ہیں کب (پورا ہوگا) یہ وعدہ اگر تم سچ کہتے ہو۔ \*48

وَ يَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٦﴾

\*48 یعنی جس وقت کے متعلق ابھی تم نے کہا ہے کہ ”ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا اور ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا“، وہ وقت آخر کب آنے گا؟ ایک مدت سے ہمارا مقدمہ چل رہا ہے۔ ہم تمہیں بار بار جھٹلا چکے ہیں اور کھلم کھلا تمہاری مخالفت کیے جا رہے ہیں اب اس کا فیصلہ کیوں نہیں کر ڈالا جاتا۔

کھدو تمہارے لئے وعدہ ہے ایک دن کا۔ نہ تاخیر کر سکتے ہو تم جسکی ایک گھڑی اور نہ جلد کر سکتے ہو۔ \*49

قُلْ لَكُمْ مِيعَادٌ يَوْمٍ لَا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ ﴿٢٧﴾

**49\*** دوسرے الفاظ میں اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے تمہاری خواہشات کے تابع نہیں ہیں کہ کسی کام کے لیے جو وقت تم مقرر کرو اسی وقت پر وہ اس کام کو کرنے کا پابند ہو۔ اپنے معاملات کو وہ اپنے ہی صوابدید کے مطابق انجام دیتا ہے۔ تم اسے کیا سمجھ سکتے ہو کہ اللہ کی اسکیم میں نوع انسانی کو کب تک اس دنیا کے اندر کام کرنے کا موقع ملنا ہے، کتنے اشخاص اور کتنی قوموں کی کس کس طرح آزمائش ہونی ہے، اور کونسا وقت اللہ ہی کی اسکیم میں مقرر ہے اسی وقت پر یہ کام ہو گا۔ نہ تمہارے تقاضوں سے وہ وقت ایک سیکنڈ پہلے آئے گا اور نہ تمہاری التجاؤں سے وہ ایک سیکنڈ کے لیے ٹل سکے گا۔

اور کہا انہوں نے جنہوں نے کفر کیا کہ ہرگز نہیں ایمان لائیں گے ہم اس قرآن پر اور نہ اس (کتاب) پر جو اس سے پہلے تھی <sup>50\*</sup>۔ اور کاش تم دیکھو جب یہ ظالم کھڑے کئے جائیں گے اپنے رب کے سامنے۔ رد کردینگے انہیں سے ایک دوسرے کی بات۔ کہیں گے وہ جو لوگ کمزور کئے جاتے تھے ان سے جو تکبر کرتے تھے اگر نہ ہوتے تم تو ہم ہوتے ایمان والے۔ <sup>51\*</sup>

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ  
بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ  
يَدَيْهِ ۗ وَ لَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ  
مَوْقُوفُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ  
إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ ۗ يَقُولُ الَّذِينَ  
اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْ لَأَ  
أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ﴿٥١﴾

**50\*** مراد میں کفار عرب جو کسی آسمانی کتاب کو نہیں مانتے تھے۔

**51\*** یعنی عوام الناس، جو آج دنیا میں اپنے لیڈروں، سرداروں، پیروں اور حاکموں کے پیچھے آسکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں، اور ان کے خلاف کسی ناصح کی بات پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، یہی عوام جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ حقیقت کیا تھی اور ان کے یہ پیشوا انہیں کیا باور کرا رہے تھے، اور جب انہیں یہ پتہ چل جائے گا کہ ان رہنماؤں کی پیروی انہیں کس انجام سے دوچار کرنے والی ہے، تو یہ اپنے ان بزرگوں پر پلٹ پڑیں گے اور چیخ چیخ کر کہیں گے کہ کم بخوت تم نے ہمیں گمراہ کیا، تم ہماری ساری مصیبتوں کے ذمہ دار

ہو، تم ہمیں نہ بہکاتے تو ہم خدا کے رسولوں کی بات مان لیتے۔

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا  
اِنَّهُمْ صَدَدْنَكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ  
جَاءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ جٰحِرِمِيْنَ ﴿٥٢﴾

کہیں گے وہ لوگ جو متکبر کرتے تھے ان سے جو  
کمزور تھے کیا ہم نے روکا تھا تمکو ہدایت سے  
اسکے بعد جب وہ تمہارے پاس آچکی تھی۔ بلکہ  
تم ہی تھے مجرم۔ \*52

\*52 یعنی وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس ایسی کوئی طاقت نہ تھی جس سے ہم چند انسان تم کروڑوں انسانوں کو  
زبردستی اپنی پیروی پر مجبور کر دیتے۔ اگر تم ایمان لانا چاہتے تو ہماری سرداریوں اور پیشوائیوں اور حکومتوں کا تختہ  
اٹ سکتے تھے۔ ہماری فوج تو تم ہی تھے۔ ہماری دولت اور طاقت کا سرچشمہ تو تمہارے ہی ہاتھ میں تھا۔ تم  
نذرانے اور ٹیکس نہ دیتے تو ہم مفلس تھے۔ تم ہمارے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے تو ہماری پیروی ایک دن نہ  
چلتی۔ تم زندہ باد کے نعرے نہ مارتے تو کوئی ہمارا پوچھنے والا نہ ہوتا۔ تم ہماری فوج بن کر دنیا بھر سے ہمارے  
لیے لڑنے پر تیار نہ ہوتے تو ایک انسان پر بھی ہمارا بس نہ چل سکتا تھا۔ اب کیوں نہیں مانتے کہ دراصل تم  
خود اس راستے پر نہ چلنا چاہتے تھے جو رسولوں نے تمہارے سامنے پیش کیا تھا۔ تم اپنی اغراض اور خواہشات  
کے بندے تھے اور تمہارے نفس کی یہ مانگ رسولوں کی بتائی ہوئی راہ تقویٰ کے بجائے ہمارے یہاں پوری  
ہوتی تھی۔ تم حرام و حلال سے بے نیاز ہو کر عیش دنیا کے طالب تھے اور وہ ہمارے پاس ہی تمہیں نظر آتا  
تھا۔ تم ایسے پیروں کی تلاش میں تھے جو تمہیں ہر طرح کے گناہوں کی کھلی چھوٹ دیں اور کچھ نذرانہ لے کر خدا  
کے ہاں تمہیں بخشوا دینے کی خود ذمہ داری لے لیں۔ تم ایسے پنڈتوں اور مولویوں کے طلب گار تھے جو ہر  
شرک اور ہر بدعت اور تمہارے نفس کی ہر دل پسند چیز کو عین حق ثابت کر کے تمہارا دل خوش کریں اور اپنا کام  
بنائیں۔ تم کو ایسے جعل سازوں کی ضرورت تھی جو خدا کے دین کو بدل کر تمہاری خواہشات کے مطابق ایک نیا  
دین گھڑیں۔ تم کو ایسے لیڈر درکار تھے جو کسی نہ کسی طرح تمہاری دنیا بنا دیں خواہ عاقبت بگڑے یا درست ہو۔  
تم کو ایسے حاکم مطلوب تھے جو خود بد کردار اور بد دیانت ہوں اور ان کی سرپرستی میں تمہیں ہر قسم کے گناہوں اور



بد کرداریوں کی چھوٹ ملی رہے۔ اس طرح ہمارے اور تمہارے درمیان برابر کا لین دین کا سودا ہوا تھا۔ اب تم کہاں یہ ڈھونگ رچانے چلے ہو کہ گویا تم بڑے معصوم لوگ تھے اور ہم نے زبردستی تمہیں بگاڑ دیا تھا۔

اور کہیں گے وہ لوگ جو کمزور تھے ان سے جو تکبر کرتے تھے۔ بلکہ یہ سازش تھی رات اور دن کی جب تم حکم دیتے تھے ہم کو کہ ہم کفر کریں اللہ کے ساتھ اور بنائیں اسکا شریک <sup>53\*</sup>۔ اور چھپائیں گے ندامت جب دیکھیں گے وہ عذاب اور ہم ڈال دیں گے طوق گردنوں میں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا۔ کیا وہ بدلہ پانینگے مگر اسی کا جو وہ کیا کرتے تھے۔

وَ قَالَ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ الْيَلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَأْمُرُونَنَا اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهُ اَنْدَادًا ۗ وَاَسْرُوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاُوا الْعَذَابَ ۗ وَجَعَلْنَا الْاَغْلَلَ فِيْ اَعْنَاقِ الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

**53\*** دوسرے الفاظ میں ان عوام کا جواب یہ ہو گا کہ تم اس ذمہ داری میں ہم کو برابر کا شریک کہاں ٹھیرانے دے رہے ہو۔ کچھ یہ بھی یاد ہے کہ تم نے اپنی چال بازیوں، فریب کاریوں اور جھوٹے پروپیگنڈوں سے کیا طلسم باندھ رکھا تھا، اور رات دن غلغلا کو پھانسنے کے لیے کیسے کیسے جتن تم کیا کرتے تھے۔ معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ تم نے ہمارے سامنے دنیا پیش کی اور ہم اس پر سمجھ گئے۔ امر واقعہ یہ بھی تو ہے کہ تم شب و روز کی مکاریوں سے ہم کو بے وقوف بناتے تھے اور تم میں سے ہر شکاری روز ایک نیا جال بن کر طرح طرح کی تدبیروں سے اللہ کے بندوں کو اس میں پھانستا تھا۔

قرآن مجید میں پیشواؤں اور پیروں کے اس جھگڑے کا ذکر مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے آیا ہے۔ تفصیل کے لیے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: اعراف، آیات 38-39۔ ابراہیم، 21۔ القصص، 63۔ الاحزاب، 66-68۔ المؤمن، 47-48۔ حم السجدہ، 29۔

اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا مگر کہا اسکے خوشحال لوگوں نے۔ یقیناً ہم وہ جو تم دے کر بھیجے گئے ہو اسکا انکار کرتے ہیں۔ \*54

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كٰفِرُونَ ﴿٢٤﴾

\*54 یہ بات قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ انبیاءِ علیہم السلام کی دعوت کا مقابلہ سب سے پہلے اور سب سے آگے بڑھ کر ان خوشحال طبقوں نے کیا ہے جو دولت و حشمت اور نفوذ و اقتدار کے مالک تھے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: الانعام، 123۔ الاعراف، 60-66-75-88-90 ہود، 27۔ بنی اسرائیل، 16۔ المومنون، 24-33 تا 38-46-47۔ الزخرف، 23۔

اور کہا انہوں نے ہم زیادہ ہیں اموال اور اولاد میں اور نہیں ہیں ہم عذاب دیے جانوالوں میں \*55

وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَ أَوْلَادًا وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿٢٥﴾

\*55 ان کا استدلال یہ تھا کہ ہم تم سے زیادہ اللہ کے پیارے اور پسندیدہ لوگ ہیں، جہی تو اس نے ہم کو ان نعمتوں سے نوازا ہے جن سے تم محروم ہو، یا کم از کم ہم سے فروتر ہو۔ اگر اللہ ہم سے راضی نہ ہوتا تو یہ سرو سامان اور یہ دولت و حشمت ہمیں کیوں دیتا۔ اب یہ بات ہم کیسے باور کر لیں کہ اللہ یہاں تو ہم پر نعمتوں کی بارش کر رہا ہے اور آخرت میں جا کر ہمیں عذاب دے گا۔ عذاب ہونا ہے تو ان پر ہونا ہے جو یہاں اس کی نوازشوں سے محروم ہیں۔

قرآن مجید میں دنیا پرستوں کی اس غلط فہمی کا بھی جگہ جگہ ذکر کر کے اس کی تردید کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: البقرہ، 126-212۔ التوبہ، 55-69۔ ہود، 3-27۔ الرعد، 26۔ الکہف، 34 تا 43۔ مریم، 73 تا 77۔ طہ، 131۔ المومنون، 55-61۔ الشعراء، 111۔ القصص، 76 تا 83۔ الروم، 9۔ المدثر، 11 تا 26۔ الفجر 15 تا 20۔

کہدو یقیناً میرا رب فراخ کر دیتا ہے رزق کو جسکے

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ

لئے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے لیکن اکثر لوگ  
 نہیں جانتے۔ \*56

يَشَاءُ وَ يَقْدِرُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا  
 يَعْلَمُونَ ﴿٦٦﴾

\*56 یعنی دنیا میں رزق کی تقسیم کا انتظام اس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اس کو یہ لوگ نہیں سمجھتے اور اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ جسے اللہ کثادہ رزق دے رہا ہے وہ اس کا محبوب ہے، اور جسے تنگی کے ساتھ دے رہا ہے وہ اس کے غضب میں مبتلا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی شخص ذرا آنکھیں کھول کر دیکھے تو اسے نظر آسکتا ہے کہ بسا اوقات بڑے ناپاک اور گھناؤنے کردار کے لوگ نہایت خوشحال ہوتے ہیں، اور بہت سے نیک اور شریف انسان، جن کی کردار کی خوبی کا ہر شخص معترف ہوتا ہے، تنگ دستی میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ اب آخر کون صاحب عقل آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ کو یہ پاکیزہ اخلاق کے لوگ ناپسند ہیں اور وہ شریر و غبیث لوگ ہی اسے بھلے لگتے ہیں۔

اور نہیں تمہارے مال اور نہ تمہاری اولاد  
 ایسے کہ قریب کر دیں تمکو ہم سے کسی درجہ میں  
 سوائے اسکے جو ایمان لایا اور کرتا رہا نیک عمل  
 - \*57 پس یہ لوگ ہیں جنکے لئے ہے اجر دگنا  
 بسبب جو عمل انہوں نے کئے اور وہ ہونگے بلند  
 عمارتوں میں امن سے۔ \*58

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي  
 تُقَرَّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ آمَنَ وَ  
 عَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ  
 الضَّعْفِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ  
 آمِنُونَ ﴿٦٧﴾

\*57 اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ سے قریب کرنے والی چیز مال اور اولاد نہیں ہے بلکہ ایمان و عمل صالح ہے۔ دوسرے یہ کہ مال اور اولاد صرف اس مومن صالح انسان ہی کے لیے ذریعہ تقرب بن سکتے ہیں جو اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور اپنی اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت سے خدا شناس اور نیک کردار بنانے کی کوشش کرے۔



**58\*** اس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ ان کی یہ نعمت لازوال ہوگی اور اس اجر کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ کیونکہ جس عیش کے کبھی ختم ہو جانے کا خطرہ ہو اس سے انسان پوری طرح مطمئن ہو کر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم کب یہ سب کچھ چھن جائے۔

اور جو لوگ کوشش کرتے ہیں ہماری آیتوں کو نیچا دکھانے کی وہ عذاب میں حاضر کئے جائیں گے۔

وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ  
أُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحَضَّرُونَ ﴿٢٨﴾

کمدو یقیناً میرا رب فراخ کر دیتا ہے رزق جسکے لئے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور تنگ کر دیتا ہے جسکے لئے (چاہتا ہے)۔ <sup>59\*</sup> اور جو خرچ کرو گے تم کوئی چیز تو وہ عوض دیگا اسکا اور وہ ہے سب سے بہتر رزق دینے والا۔ <sup>60\*</sup>

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ  
مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ وَ مَا أَنْفَقْتُمْ  
مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ وَ هُوَ خَبِيرٌ  
الرَّزِيقِينَ ﴿٢٩﴾

**59\*** اس مضمون کو بتکرار بیان کرنے سے مقصود اس بات پر زور دینا ہے کہ رزق کی کمی و بیشی اللہ کی مشیت سے تعلق رکھتی ہے جب کہ اس کی رضا سے مشیت الہی کے تحت اچھے اور برے ہر طرح کے انسانوں کو رزق مل رہا ہے۔ خدا کا اقرار کرنے والے بھی رزق پا رہے ہیں اور اس کا انکار کرنے والے بھی۔ نہ رزق کی فراوانی اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی خدا کا پسندیدہ بندہ ہے، اور نہ اس کی تنگی اس امر کی علامت ہے کہ آدمی اس کا مغضوب ہے۔ مشیت کے تحت ایک ظالم اور بے ایمان آدمی پھلتا پھولتا ہے، حالانکہ ظلم اور بے ایمانی خدا کو پسند نہیں ہے۔ اور اس کے برعکس مشیت ہی کے تحت ایک سچا اور ایمان دار آدمی نقصان اٹھاتا اور تکلیفیں سہتا ہے، حالانکہ یہ صفات خدا کو پسند ہیں۔ لہذا وہ شخص گمراہ ہے جو مادی فوائد و منافع کو خیر و شر کا پیمانہ قرار دیتا ہے۔ اصل چیز خدا کی رضا ہے اور وہ ان اخلاقی اوصاف سے حاصل ہوتی ہے جو خدا کو محبوب ہیں۔ ان اوصاف کے ساتھ اگر کسی کو دنیا کی نعمتیں حاصل ہوں تو یہ بلاشبہ خدا کا فضل ہے جس پر شکر ادا کرنا

چاہیے۔ لیکن اگر ایک شخص اخلاقی اوصاف کے لحاظ سے خدا کا باغی و نافرمان بندہ ہو اور اس کے ساتھ دنیا کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سخت باز پرس اور بدترین عذاب کے لیے تیار ہو رہا ہے۔

**60\*** رازق، صانع، موجد، معطی اور ایسی ہی دوسری بہت سی صفات ایسی ہیں جو اصل میں تو اللہ تعالیٰ ہی کی صفات ہیں مگر مجازاً بندوں کی طرف بھی منسوب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ہم ایک شخص کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نے فلاں شخص کے روزگار کا بندوبست کر دیا، یا اس نے یہ عطیہ دیا، یا اس نے فلاں چیز بنائی یا ایجاد کی۔ اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خیر الرازقین کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ یعنی جن جن کے متعلق تم گمان رکھتے ہو کہ وہ روزی دینے والے ہیں ان سب سے بہتر روزی دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ  
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اٰهْلًاۤ اِيَّاكُمْ كَانُوۡا يَعْبُدُوۡنَ

اور جس دن وہ جمع کرے گا ان کو اکٹھا پھر  
فرمائے گا فرشتوں سے۔ کیا یہی لوگ ہیں جو  
تمہاری عبادت کرتے تھے۔\*61



**61\*** قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دور کے مشرکین فرشتوں کو دیوی اور دیوتا قرار دے کر ان کے بت بناتے اور ان کی پرستش کرتے رہے ہیں۔ کوئی بارش کا دیوتا ہے تو کوئی بجلی کا اور کوئی ہوا کا۔ کوئی دولت کی دیوی ہے تو کوئی علم کی اور کوئی موت و ہلاکت کی۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ قیامت کے روز ان فرشتوں سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم ہی ان لوگوں کے معبود بنے ہوئے تھے؟ اس سوال کا مطلب محض دریافت حال نہیں ہے بلکہ اس میں یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ کیا تم ان کی اس عبادت سے راضی تھے؟ کیا تم نے یہ کہا تھا کہ لوگو ہم تمہارے معبود ہیں، تم ہماری پوجا کیا کرو؟ یا تم نے یہ چاہا کہ یہ لوگ تمہاری پوجا کریں؟ قیامت میں یہ سوال صرف فرشتوں ہی سے نہیں بلکہ تمام ان ہستیوں سے کیا جائے گا جن کی دنیا میں عبادت کی گئی ہے۔ چنانچہ سورہ فرقان میں ارشاد ہوا ہے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَقُولُۤ اَنْتُمْۤ اَصْلَلْتُمْۤ عِبَادِيَۤ هٰۤؤُلَآءِۤ اَمْ هُمْۤ ضَلُّوا۟ السَّبِيۡلَ۔ (آیت 17)۔  
جس روز اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اور ان ہستیوں کو جن کی یہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں جمع کریگا، پھر پوچھے گا کی

تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود راہِ راست سے بھٹک گئے تھے؟

وہ کہیں گے تو پاک ہے۔ تو ہی ہمارا کار ساز ہے ان کے سوائے۔<sup>62</sup> بلکہ یہ پوجا کرتے تھے جنات کو۔ ان میں سے اکثر انہی پر ایمان رکھتے تھے۔<sup>63</sup>

قَالُوا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيْنَا مِنْ دُوْنِهِمْ  
بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّۗ اَكْثَرَهُمْ بِهِمُّ  
مُّؤْمِنُوْنَ ﴿٤١﴾

**62\*** یعنی وہ جواب دیں گے کہ حضور کی ذات اس سے منزہ اور بالا تر ہے کہ کوئی دوسرا خدائی و معبودیت میں آپ کا شریک ہو۔ ہمارا ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم ان سے اور ان کے افعال سے بری الذمہ ہیں۔ ہم تو حضور کے بندے ہیں۔

**63\*** اس فقرے میں جن سے مراد شیاطین جن ہیں۔ فرشتوں کے اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو یہ ہمارے نام لے کر، اور اپنے تخیلات کے مطابق ہماری صورتیں بنا کر گویا ہماری عبادت کرتے تھے، لیکن دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ شیاطین کی بندگی کر رہے تھے، کیونکہ شیاطین ہی نے ان کو یہ راستہ دکھایا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا حاجت روا سمجھو اور ان کے آگے نذر و نیاز پیش کیا کرو۔

یہ آیت صریح طور پر ان لوگوں کے خیال کی غلطی واضح کر دیتی ہے جو ”جن“ کو پہاڑی علاقے کے باشندوں یا دہقانوں اور صحرائیوں کے معنی میں لیتے ہیں۔ کیا کوئی صاحب عقل آدمی اس آیت کو پڑھ کر یہ تصور کر سکتا ہے کہ لوگ کوہستانی اور صحرائی اور دیہاتی آدمیوں کی عبادت کیا کرتے تھے اور انہی پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ اس آیت سے عبادت کے بھی ایک دوسرے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت صرف پرستش اور پوجا پاٹ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ کسی کی حکم پر چلنا اور اس کی بے چون و چرا اطاعت کرنا بھی عبادت ہی ہے۔ حتیٰ کہ اگر آدمی کسی پر لعنت بھیجتا ہو (جیسا کہ شیطان پر بھیجتا ہے) اور پھر بھی پیروی اسی کے طریقے کی کیے جا رہا ہو تب بھی وہ اس کی عبادت کا مرتکب ہے۔ اس کی دوسری مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو (تفہیم القرآن جلد اول، النساء حاشیہ 145، المائدہ 91، جلد دوم، التوبہ حاشیہ 31، جلد سوم، مریم حاشیہ 27، القصص، حاشیہ 86)



پس آج نہیں اختیار رکھتے تم میں سے کوئی کسی دوسرے پر نفع اور نہ نقصان کا اور ہم کہیں گے ان سے جنہوں نے ظلم کیا کہ چکھو عذاب آگ کا وہ تم جس کو جھٹلاتے تھے۔

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا وَ نَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿٤٢﴾

اور جب پڑھی جاتی ہیں انہر ہماری روشن آیتیں تو کہتے ہیں نہیں ہے یہ سوائے ایک شخص کے جو چاہتا ہے کہ روک دے تمکو اس سے جسکی عبادت کیا کرتے تھے تمہارے باپ دادا۔ اور کہا انہوں نے کہ نہیں ہے یہ مگر ایک جھوٹ جو گھڑ لیا گیا ہے۔ اور کہا انلوگوں نے جنہوں نے کفر کیا حق کے بارے میں جب وہ آیا انکے پاس۔ نہیں ہے یہ مگر کھلا جادو۔

وَ إِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَنْ يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانْتُمْ يَعْبُدُ آبَاءَكُمْ وَ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا إِفْكٌ مُّفْتَرًى وَ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٤٣﴾

اور نہیں دی تمہیں ہم نے انکو کتابیں جنکو یہ پڑھتے ہوں اور نہ ہی ہم نے بھیجا ان کی طرف تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا۔ \*64

وَ مَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا وَ مَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَذِيرٍ ﴿٤٤﴾

\*64 یعنی اس سے پہلے نہ کوئی کتاب خدا کی طرف سے ایسی آئی ہے اور نہ کوئی رسول ایسا آیا ہے جس نے اگر ان کو یہ تعلیم دی ہو کہ یہ اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی و پرستش کیا کریں۔ اس لیے یہ لوگ کسی علم کی بنا پر نہیں بلکہ سراسر جہالت کی بنا پر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید کا انکار کر رہے ہیں۔ اس کے لیے ان کے پاس کوئی سند نہیں ہے۔

اور تکذیب کی تھی اُن لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے۔ اور نہیں پہنچے یہ دسویں حصے کو جو ہم نے اُنکو دیا تھا پھر جھٹلایا تھا انہوں نے میرے رسولوں کو سوکیسا ہوا میرا انکار۔ \*65

وَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَ مَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٦﴾

\*65 یعنی مکے کے لوگ تو اس قوت و شوکت اور اس خوشحالی کے عشر عشر کو بھی نہیں پہنچے ہیں جو ان قوموں کو حاصل تھی۔ مگر دیکھ لو کہ جب انہوں نے ان حقائق کو ماننے سے انکار کیا جو انبیاءِ علیہم السلام نے ان کے سامنے پیش کیے تھے، اور باطل پر اپنے نظام زندگی کی بنیاد رکھی تو آخر کار وہ کس طرح تباہ ہوئیں اور ان کی قوت و دولت ان کے کسی کام نہ آسکی۔

کہدو کہ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں صرف ایک بات کی کہ تم کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لئے دو دو اور اکیلے پھر غور کرو۔ نہیں ہے تمہارے رفیق کو کوئی جنون \*66 نہیں ہے یہ سوائے ڈرانے والا تلو آنے سے پہلے ایک سخت عذاب کے۔ \*67

قُلْ إِنَّمَا آعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مثنًى وَ فَرَادًى ثُمَّ تَتَفَكَّرُونَ ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ ۚ إِن هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ﴿٤٧﴾

\*66 یعنی اغراض اور خواہشات سے پاک ہو کر خالصتہً لِلَّهِ غور کرو۔ ہر شخص الگ الگ بھی نیک نیتی کے ساتھ سوچے اور دو دو پار پار آدمی سر جوڑ کر بھی بے لاگ طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ بحث کر کے تحقیق کریں کہ آخر وہ کیا بات ہے جس کی بنا پر آج تم اس شخص کو مجنون ٹھہرا رہے ہو جسے کل تک تم اپنے درمیان نہایت دانا آدمی سمجھتے تھے۔ آخر نبوت سے تھوڑی ہی مدت پہلے کا تو واقعہ تھا کہ تعمیر کعبہ کے بعد حجرِ اسود نصب کرنے کے مسئلے پر جب قبائل قریش باہم لڑ پڑے تھے تو تم ہی لوگوں نے بالاتفاق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تسلیم کیا تھا اور انہوں نے ایسے طریقے سے اس جھگڑے کو چکایا تھا جس پر تم سب مطمئن ہو

گئے تھے۔ جس شخص کی عقل و دانش کا یہ تجربہ تمہاری ساری قوم کو ہو چکا ہے، اب کیا بات ایسی ہو گئی کہ تم اسے مجنون کہنے لگے؟ ہٹ دھرمی کی تو بات ہی دوسری ہے، مگر کیا واقعی تم اپنے دلوں میں بھی وہی کچھ سمجھتے ہو جو اپنی زبانوں سے کہتے ہو؟

**67\*** یعنی کیا یہی وہ قصور ہے جس کی بنا پر تم اسے جنون کا مریض ٹھیراتے ہو؟ کیا تمہارے نزدیک عقلمند وہ ہے جو تمہیں تباہی کے راستے پر جاتے دیکھ کر کہے کہ شاباش، بہت اچھے جا رہے ہو، اور مجنون وہ ہے جو تمہیں برا وقت آنے سے پہلے خبردار کرے اور فساد کی جگہ صلاح کی راہ بتائے۔

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ  
 إِنَّ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَهُوَ عَلَى  
 كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿٤٧﴾

کہدو کہ جو مانگا ہو میں نے تم سے کوئی اجر تو وہ ہے تمہارا۔ **68\*** نہیں ہے میرا اجر مگر اللہ کے ذمے۔ اور وہ ہے ہر چیز پر شاہد۔

**68\*** اصل الفاظ ہیں مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ۔ اس کا ایک مطلب تو وہ ہے جو اوپر ہم نے ترجمہ میں بیان کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری بھلائی کے سوا میں اور کچھ نہیں چاہتا، میرا اجر بس یہی ہے کہ تم درست ہو جاؤ۔ اس مضمون کو دوسری جگہ قرآن مجید میں یوں ادا کیا گیا ہے:

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ سَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا۔ (الفرقان 57)

اے نبی، ان سے کہو میں اس کام پر تم سے کوئی اجر اس کے سوا نہیں مانگتا کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔

**69\*** یعنی الزام لگانے والے جو کچھ چاہیں الزام لگاتے رہیں، مگر اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ گواہ ہے کہ میں ایک بے غرض انسان ہوں، یہ کام اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَامًا  
 الْغُيُوبِ ﴿٤٨﴾

کہدو کہ بیشک میرا رب بھیج دیتا ہے حق کو **70\*** جاننے والا ہے غیب کا۔



**70\*** اصل الفاظ میں يَقْذِفُ بِالْحَقِّ۔ اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ وحی کے ذریعہ سے وہ علمِ حق میرے اوپر القا کرتا ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ حق کو غالب کر رہا ہے، باطل کے سر پر حق کی ضرب لگا رہا ہے۔

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَ مَا يُبْدِيئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيدُ ۝

نہ دہرائے گا۔

قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۖ  
وَ إِنْ اهْتَدَيْتُ فِيمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي ۖ  
إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ۝

نہ دہرائے گا۔

**71\*** اس زمانے کے بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ اس کی رو سے بنی صلی اللہ علیہ و سلم گمراہ ہو سکتے تھے، بلکہ ہو جایا کرتے تھے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے خود حضور سلم ہی کی زبان سے یہ کہلوا دیا کہ اگر میں گمراہ ہوتا ہوں تو اپنی گمراہی کا خود ذمہ دار ہوتا ہوں اور راہِ راست پر میں بس اس وقت ہوتا ہوں جب میرا رب مجھ پر وحی (یعنی آیات قرآنی) نازل کرتا ہے۔ اس غلط تاویل سے یہ ظالم گویا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضور سلم کی زندگی معاذ اللہ ہدایت و ضلالت کا مجموعہ تھی اور اللہ تعالیٰ نے کفار کے سامنے حضور سلم سے یہ اعتراف اس لیے کروا رہا تھا کہ ہمیں کوئی شخص آپ سلم کو بالکل ہی راہِ راست پر سمجھ کر آپ کی مکمل پیروی نہ اختیار کر بیٹھے حالانکہ جو شخص بھی سلسلہ کلام پر غور کرے گا وہ جان لے گا کہ یہاں ”اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں“ کے الفاظ اس معنی میں نہیں کہے گئے ہیں کہ معاذ اللہ حضور سلم فی الواقع گمراہ ہو جاتے تھے، بلکہ پوری بات اس معنی میں کہی گئی ہے کہ ”اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں، جیسا کہ تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو، اور میرا یہ نبوت کا دعویٰ اور میری یہ دعوت توحید اسی گمراہی کا نتیجہ ہے جیسا کہ تم گمان کر رہے ہو، تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہی پڑے گا، اس کی ذمہ داری میں تم نہ پکڑے جاؤ گے۔ لیکن اگر میں ہدایت پر ہوں، جیسا کہ درحقیقت ہوں،

تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی آتی ہے جس کے ذریعہ سے مجھے راہ راست کا علم حاصل ہو گیا ہے۔ میرا رب قریب ہی موجود ہے اور سب کچھ سن رہا ہے، اسے معلوم ہے کہ میں گمراہ ہوں یا اس کی طرف سے ہدایت یافتہ۔“

اور کاش تم دیکھو جب یہ گھبرا جائیں گے تو نہیں بچ سکیں گے اور پکڑ لئے جائیں گے نزدیک کی جگہ سے۔\*72

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فَزِعُوا فَلَا فَوْتَ وَ  
أَخَذُوا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ﴿٥١﴾

\*72 یعنی قیامت کے روز ہر مجرم اس طرح پکڑا جائے گا کہ گویا پکڑنے والا قریب ہی کہیں چھپا کھڑا تھا، ذرا اس نے بھاگنے کی کوشش کی اور فوراً ہی دھر لیا گیا۔

اور کہیں گے کہ ایمان لائے ہم اس پر۔\*73 اور کہاں ہو گا ان کے لئے پہنچنا (ایمان تک) اتنی دور کی جگہ سے۔\*74

وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ ؕ وَ أَنَّىٰ لَهُمُ التَّنَاطُشُ  
مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿٥٢﴾

\*73 مراد یہ ہے کہ اس تعلیم پر ایمان لے آئے جو رسولِ مسلم نے دنیا میں پیش کی تھی۔  
\*74 یعنی ایمان لانے کی جگہ تو دنیا تھی اور وہاں سے اب یہ بہت دور نکل آئے ہیں۔ عالم آخرت میں پہنچ جانے کے بعد اب توبہ و ایمان کا موقع کہاں مل سکتا ہے۔

اور یقیناً انہوں نے کفر کیا اسکا پہلے اور اکل کے تیر چلاتے رہے غیب پر دور ہی کی جگہ سے۔\*75

وَقَدْ كَفَرُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ وَ يَقْدِرُونَ  
بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿٥٣﴾

\*75 یعنی رسولِ مسلم اور تعلیمات رسولِ مسلم اور اہل ایمان پر طرح طرح کے الزامات لگاتے، آوازے کتے اور فقرے چمت کرتے تھے۔ کبھی کہتے یہ شخص ساحر ہے۔ کبھی کہتے مجنون ہے۔ کبھی توحید کا مذاق اڑاتے اور

کبھی آخرت کے نخیل پر باتیں چھانٹتے۔ کبھی یہ افسانہ تراشتے کہ رسولِ مسلم کو کوئی اور سکھاتا پڑھاتا ہے اور کبھی ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے کہ یہ محض اپنی نادانی کی وجہ سے رسولِ مسلم کے پیچھے لگ گئے ہیں۔

اور پردہ حائل کر دیا گیا ان کے درمیان اور اسکے جو خواہش وہ کرتے ہیں جیسا کہ کیا گیا انکے ہم جنسوں سے پہلے۔ یقیناً وہ تھے تردد کے شک میں۔ \*76

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِمْ مِمَّنْ قَبْلُ إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مُّرِيبٍ ﴿٧٦﴾

\*76 درحقیقت شرک اور دہریت اور انکارِ آخرت کے عقائد کوئی شخص بھی یقین کی بنا پر اختیار نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یقین صرف علم سے حاصل ہوتا ہے، اور کسی شخص کو بھی یہ علم حاصل نہیں ہے کہ خدا نہیں ہے، یا بہت سے خدا ہیں یا خدائی کے اختیارات میں بہت سی ہستیوں کو دخل حاصل ہے، یا آخرت نہیں ہونی چاہیے۔ پس جس نے بھی دنیا میں یہ عقائد اختیار کیے ہیں اس نے محض قیاس و گمان پر ایک عمارت کھڑی کر لی ہے جس کی اصل بنیاد شک کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور یہ شک انہیں سخت گمراہی کی طرف لے گیا ہے۔ انہیں خدا کے وجود میں شک ہوا۔ انہیں توحید کی صداقت میں شک ہوا۔ انہیں آخرت کے آنے میں شک ہوا۔ حتیٰ کہ اس شک کو انہوں نے یقین کی طرح دلوں میں بٹھا کر انبیاء کی کوئی بات نہ مانی اور اپنی زندگی کی پوری مہلت عمل ایک غلط راستے میں کھپا دی۔

